Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1967

سچّے موتی

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

(مسلم)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ

چند اہم کتابیں

(۱) انسان نے کیا سوچا !

انسان نے وحی کی راہ نمائی کے بغیر تنہا اپنی عقل کے زور سے زندگی کے اہم مسائل سلجھانے کے لئے جس قدر کوششیں کی ہیں ۔ ان کا حقیقت کشا بیان ۔ علمی دنیا کی معرکہ آرا تصنیف ۔ قیمت مجلد (تقطیع کلاں) بارہ روپے ۔

(۲) اسلام کیا ہے ؟

اس اہم سوال کا بصیرت افروز جواب ۔ قسم اعلیٰ : آٹھ روپے
چیپ ایڈیشن : چار روپے

(۳) معاسبیل :

پرویز صاحب کے فکر انگیز ۔ انقلاب آفرین مقالات کا مجموعہ ۔
قیمت : آٹھ روپے

(۴) بہارِ نو :

مقالات کے مجموعے کا دوسرا حصہ جس سے ذہن میں جلا پیدا ہو جاتا ہے ۔
قیمت : پانچ روپے

(۵) آسمانی کتابیں :

تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی ۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں ۔ کن کن مراحل سے گذریں اور آج کس حالت میں ہیں ۔
قیمت اعلیٰ : پانچ روپے
چیپ ایڈیشن : تین روپے

(۶) عربی خود سیکھئے :

نہایت آسان زبان میں بغیر استاد کی مدد کے چند مہینوں میں عربی سکھا دینے والی کتاب ۔ قیمت : اڑھائی روپیہ

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۲۵/بی گلبرگ ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

سالانہ ـــــ پاکستان ـــــ دس روپے

سالانہ ـــــ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے

سالانہ ـــــ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ایک روپیہ

ہندوستان ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

۲۵ بی گلبرگ ۔ لاہور

جلد ۲۰ — جنوری ۱۹۶۷ء — نمبر ۱

فہرست مضامین

(۱) لمعات ـــــ ۲

(۲) چین کا عالمی کردار ـــــ (خورشید عالم صاحب) ـــــ ۱۰

(۳) ماؤزے تنگ ـ اور ـ قرآن ـــــ (پرویز صاحب) ـــــ ۱۷

(۴) باب المراسلات ـــــ (بیویوں کو مارنا) ـــــ ۴۹

(۵) رابطۂ باہمی ـــــ ۷۲

(۶) فہم قرآن ـــــ (علامہ اسلم جیراجپوری ؒ) ـــــ ۸۰

ایڈیٹر صفدر سلیمی، پبلشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آپ نے اونٹ اور بدّو کی کہانی تو سنی ہوگی۔ ایک شب بدو اپنے خیمے کے اندر سو رہا تھا کہ باہر سے کسی اونٹ نے اندر جھانکا اور نہایت لجاجت سے کہا کہ باہر سردی بڑی بلا کی ہے، میں ٹھٹھر رہا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو میں ذرا اپنا سر خیمہ کے اندر کر لوں تاکہ کچھ تو سردی سے بچاؤ ہو سکے۔ بدّو نے اس کی حالت پر رحم کھایا اور اس کی درخواست منظور کر لی۔ کچھ وقت کے بعد اونٹ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنی گردن بھی خیمہ کے اندر کر لوں، باہر سخت سردی ہے۔ بدو نے اس کی بھی اجازت دے دی۔ قصہ مختصر، آدھی رات کے قریب دیکھا یہ گیا کہ بدو خیمہ سے باہر تھا اور اونٹ خیمہ کے اندر۔

جب مئی ۱۹۴۸ء میں، فلسطین میں یہودیوں نے اپنے پاؤں جمانے تھے، تو بھانپنے والی نگاہوں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد بدو خیمہ سے باہر ہوگا، اور اونٹ خیمہ کے اندر۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہاں یہودیوں نے اپنے کھونٹے گاڑنے شروع کر دیئے۔ لاکھوں کی تعداد میں بیرونی ممالک کے یہودی فلسطین میں آ بسے اور فلسطین کے عرب باشندے دھکیل کر باہر نکال دیئے گئے جہاں وہ کھلے صحرا میں آسمان کی چھت کے نیچے گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ اور سردیوں کی یخ بستہ راتوں میں مصروف تنفس شماری ہیں۔ اس علاقہ میں اس طرح متمکن ہونے کے بعد اب وہاں کے یہودیوں نے آگے پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اردن، اور شام کے علاقوں پر ابتدائی (امتحانی) حملے بھی شروع کر دیئے ہیں۔ اس ابتدا کی جو انتہا ہو سکتی ہے، اس کے متعلق کسی ستارہ شناس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ فلسطین عصر حاضر کے ان مسائل میں سے ہے جو اپنے اندر ارباب بصیرت کے لئے

ہزار سامانِ عبرت و موعظت رکھتا ہے، اس لئے یہ اس کا متقاضی ہے کہ اس کی پوری تاریخ، اور پس منظر مشرح و بسط سے سامنے لائے جائیں۔ اسے ہم دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سردست ہم اتنا کہنے پر اکتفا کریں گے کہ برطانیہ، امریکہ اور اقوامِ متحدہ کی تاریخ میں اس سے زیادہ شرمناک اور انسانیت سوز واقعہ شاید ہی کوئی اور ہو۔

یہودی (یعنی بنی اسرائیل) حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد، حضرت یوشع کی قیادت میں فلسطین میں داخل ہوئے۔ حضرت داؤدؑ نے پہلی مرتبہ (قریباً گیارہویں صدی قبل مسیح میں) یروشلم کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اور حضرت سلیمانؑ نے دسویں صدی (ق۔م) میں بیت المقدس کا ہیکل تعمیر کرایا۔ اس کے بعد، بنی اسرائیل کا زوال شروع ہو گیا، تا آنکہ چھٹی صدی (ق۔م) میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا۔ اس سے نہ صرف یہودیوں کی سلطنت ہی تباہ ہوئی، بلکہ ان کی قومیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اُن کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی و محکومی کی تمام ذلت آمیز اور رسوا کُن تباہیاں چاروں طرف سے ان پر مسلط ہو گئیں۔ قریب اسی سال کے زمانۂ اسارت کے بعد، فارس کے شہنشاہ سائرس، (ذوالقرنین) کے ترحمِ خسروانہ کے تصدق، یہودیوں کو پھر یروشلم میں داخلہ کی اجازت مل گئی — واپس آنے کو تو یہ واپس آ گئے۔ لیکن ان کی کھوئی ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی ثروت انہیں پھر میسر نہ آ سکی۔ یہ ایک صاحبِ اقتدار و تمکن قوم کے بجائے، ہیکل سلیمانی کے مجاوروں کی جماعت بن کر رہ گئے۔ لیکن ۷۰ء میں ان کی یہ حیثیت بھی ختم ہو گئی، جب رومیوں نے ان سے ہمیشہ کے لئے یہ علاقہ چھین لیا۔ اس کے بعد، یہودی دنیا میں صحرانوردی اور دشت پیمائی کی خانہ بدوش زندگی بسر کرتے رہے۔

مسلمانوں نے فلسطین پر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں (۶۳۶ء میں) قبضہ کیا اور اس وقت سے لے کر ۱۹۱۷ء تک (جب جنرل ایلن بی نے اسے ترکوں سے فتح کر لیا۔) یہ مسلسل مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ (اس تمام عرصہ میں، صرف چند سال کے لئے یہ صلیبیوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا)

مغربی استعماریت کو، مشرقِ وسطیٰ میں اپنے پاؤں جمانے کے لئے، ایک مستقل اڈے کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے — گذشتہ دو عالمگیر جنگوں میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ جنگ اقوامِ مغرب میں ہو رہی ہے، لیکن وہ لڑی جا رہی ہے مسلمانوں کے انہی ممالک میں — فلسطین کو ترکوں کے ہاتھ

سے چھین لینے کے بعد ان قوتوں کو اپنے پاؤں جمانے کے لئے ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ یہودی اس علاقہ پر کبھی (یعنے دو ہزار سال پہلے) حکومت کر چکے ہیں۔ اس لئے اسے یہودیوں کا وطن قرار دے دیا جائے۔ یعنے وہ عرب جو اس علاقہ کے باشندے ہی نہیں، کل تک اس کے حکمران بھی تھے، انہیں ان کے وطن سے نکال باہر کیا جائے اور ان کی جگہ یہودیوں کو وہاں لا کر بسا دیا جائے۔ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں، متعدد مخالف اور موافق قوتوں میں رسہ کشی ہوتی رہی اور قریب تیس سال تک یہ مسئلہ، مغربی بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں کا ہدف بنا رہا۔

مغربی قوتیں یہ کچھ کر رہی تھیں، اور دوسری طرف مسلمان ایک عجیب خوش فہمی میں مبتلا تھا ــــ اور اب تک مبتلا چلا آرہا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ یہود کو خدا نے مغضوب علیہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان پر "ذلّت اور مسکنت کی مار ماری گئی ہے"۔ اس لئے یہ دنیا میں کبھی اپنی حکومت قائم نہیں کر سکیں گے۔ یہ عقیدہ، قوموں کے عروج و زوال سے متعلق قرآن کریم کے ابدی قوانین اور اٹل اصولوں کے خلاف ہے۔ قوموں کی ہلاکت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک قوم اپنی قوت و دولت کھو دینے کے بعد اپنا الگ قومی تشخص بھی ضائع کر دے ــــ جیسے ھُن۔ پارتھین۔ باختریں وغیرہ قومیں ہندوستان میں آئیں۔ یہاں حکومت کی، لیکن اس کے بعد یہ اکال الامم، بھارت انہیں اس طرح نگل گیا، کہ ان کا جداگانہ قومی تشخص تک باقی نہ رہا۔ یہ وہ قومیں ہیں جن کی بازآفرینی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسے ان کی ابدی ہلاکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن دوسری شق میں وہ قومیں آتی ہیں جن پر زوال تو مسلط ہو جاتا ہے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنا ملّی تشخص قائم رکھتی ہیں ــــ جیسے ہندوستان میں، مسلمانوں کی قوم۔ اس نے یہاں حکومت کی اور پھر ان پر زوال آگیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوؤں نے ان کے جداگانہ قومی تشخص کے مٹانے کے لئے اپنا پورا زور لگایا ــــــــ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اس میں یقیناً کامیاب ہو جاتے اگر ہماری خوش بختی سے ہم میں سرسیّد، اقبال اور جناح نہ پیدا ہوتے۔ انہوں نے مسلمانوں کے جداگانہ ملّی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے جہادِ عظیم سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے دوبارہ حکومت حاصل کر لی۔ اگر ہمارا جداگانہ تشخص باقی نہ رہتا ــــ جیسا کہ مودودی صاحب بار بار کہا کرتے تھے کہ "پیدائشی مسلمانوں" کی یہ قوم باقی رہے یا نہ رہے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ــــ تو آج دنیا کے نقشہ پر نہ پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ان کی "حکومتِ الٰہیہ" کی کوئی آماجگاہ ہوتی۔

یہودیوں نے اپنی حکومت وسطوت چھن جانے کے بعد اپنا جداگانہ قومی تشخص قائم رکھا، اس لئے ان کی ہلاکت اور تباہی ان قوموں جیسی نہیں تھی جن کا قومی تشخص ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے انہیں بازآفرینی کا موقعہ حاصل تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے انہیں مغضوب علیہ کہا ہے لیکن یہ اس قوم کے ان جرائم کا فطری نتیجہ تھا جو اس سے سرزد ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے ان سے حکومت واقتدار چھن گیا تھا۔ قوموں کی زندگی میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی ایک نسل محنت وکاوش سے حکومت حاصل کرتی ہے جو ان کی آنے والی نسل میں وراثتاً منتقل ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ نسل، حکومت کی وارث بلاسعی وکاوش ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ ان صلاحیتوں کو کھو دیتی ہے، جو حکومت وثروت کے لئے ضروری ہیں، تو ان سے یہ دولت چھن جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی ایک نسل اپنے جرائم کی پاداش میں حکومت وثروت سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی آنے والی نسلوں پر بازآفرینی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو، تو یہ کھلا ہوا ظلم ہے۔ اگر کسی قوم کی ایک نسل نے دو ہزار سال پہلے اپنے اندر ایسی خرابیاں پیدا کر لی تھیں، جو ان کے زوال کا موجب بنیں، تو ان کے اس جرم کی بنا پر ان کی آنے والی تمام نسلوں پر فوز وفلاح کی راہیں مسدود کر دینا، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ اقوام وملل کے سلسلہ میں اس کا قانون یہ ہے کہ ــــ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۔ وَ لَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ــ (۲/۱۴۱)، یہ قومیں اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلی گئیں۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ تھے، تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ انہوں نے جس قسم کے کام کئے تھے، ان کا بدلہ انہیں مل گیا۔ تم جس قسم کے کام کرو گے، تمہیں ان کا بدلہ ملے گا۔ کسی سابقہ نسل کے جرائم کی پاداش میں، آنے والی نسل کو ماخوذ کر لینا، عیسائیت کا پیش کردہ تصور ہے جس کی رُو سے وہ کہتے ہیں کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم وحوا) کے گناہوں کا بوجھ اپنی پشت پر لادے دنیا میں آتا ہے اور یہ بوجھ اس کے اپنے اعمال سے اتر ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے جناب مسیح کے کفارہ پر ایمان لانا ضروری ہے ــ قرآن کا یہ تصور نہیں، اس کی رُو سے، ہر انسانی بچہ اور اس لئے ہر نئی نسل، ایک سفید وسادہ لوح لے کر پیدا ہوتی ہے اور امکانات کا پورا میدان اس کے سامنے کھلا ہوتا ہے۔ وہ جس قسم کے کام کرے گی اس کے مطابق اس کی زندگی کا نقشہ مرتب ہو جائے گا۔ قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کی روشنی میں، یہ سمجھنا کہ بنی اسرائیل کی ایک سابقہ نسل کے جرائم کی وجہ

سے، اس قوم کی آنے والی تمام نسلوں سے زندگی اور حرارت کے تمام امکانات سلب کر لئے گئے۔ خود فریبی ہے۔

مغرب کی قوتیں، فلسطین کا علاقہ عربوں سے چھین کر، یہودیوں کے حوالے کر دینے کی فکر میں تھیں اور مسلمان اس خود فریبی میں مبتلا تھے کہ ایسا ہو نہیں سکے گا کیونکہ خدا نے بنی اسرائیل کو مغضوب علیہ قرار دے رکھا ہے۔ لیکن بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ ہماری یہ خوش فہمی محض فریب نفس اور بے عملی کا بہانہ تھی۔ اور خدا کا یہ قانون مبنی برحقیقت اور اٹل تھا کہ — لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ — یہاں فیصلے نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوتے ہیں، نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق۔ یہاں ہر فیصلہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ہوتا ہے۔

یوں فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہو گئی اور ——— ہم محوِ نازِ جرس کارواں رہے!

۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو شام کے چار بجے یہ اعلان ہوا کہ ارض فلسطین میں اسرائیل کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور اس کے دو ہی منٹ بعد یہ خبر شائع ہو گئی کہ امریکہ نے اس ریاست کی آئینی حیثیت تسلیم کر لی ہے۔ اس کے بعد یورپ کی مختلف سلطنتوں کی طرف سے اسی قسم کے اعلانات ہونے لگے اس سے پہلے یہودیوں کے دو گروہوں ——— اعتدال پرست اور دہشت پسند جماعتوں ——— میں سخت اختلافات چلے آ رہے تھے۔ چند ہفتوں میں یہ اختلافات بھی ختم ہو گئے اور یہودی ریاست ایک منظم قومی وحدت کی شکل میں نقشہ پر مرتسم ہو گئی۔ اس اٹھارہ برس کے عرصہ میں اسے بیرونی ممالک سے اس قدر امداد ملی ہے اور خود داخلی طور پر اس نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اسے اب اپنے پاؤں پھیلانے کی بھی جراءت ہو گئی ہے۔ چنانچہ اُردن سے چھیڑ چھاڑ اسی مقصد کے حصول کا نقطۂ آغاز ہے۔ ان لوگوں کی شاطرانہ عیاری کو سامنے رکھئے اور دوسری طرف ہماری سادگی ملاحظہ فرمائیے کہ اسرائیلی ریاست کے اس اقدام پر، شاہ حسین نے برطانیہ اور امریکہ سے امداد کی درخواست کی ہے

میرؔ کیا سادہ ہیں، جس نے انہیں بیمار کیا
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں!

شاہ حسین نے یہ کیا ہے اور اسکے بعد انہوں نے اسلامی ممالک سے "اخوتِ اسلامی" کے نام پر اپیلیں شروع کر دی ہیں۔ "اخوتِ اسلامی" ایک بلند ترین حقیقت بھی ہے اور دل خوش کن سراب بھی — آپ شاید حیران ہوں گے کہ ہم نے بیک نفس اس قدر متضاد باتیں کیسے کہہ دیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے۔

اخوتِ اسلامی ایک بلند ترین حقیقت اس لئے ہے کہ قرآن کریم نے رنگ، نسل، زبان، وطن کے تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر اشتراکِ ایمان (آئیڈیالوجی) کی بنا پر وحدتِ انسانیہ کا اصول پیش کیا اور حضور نبی اکرمؐ نے اپنے عدیم النظیر عمل سے اس اصول کو محسوس پیکر عطا فرمایا اور اس طرح ایک ایسی برادری کی تشکیل کر دی جس میں فارس کا سلمان، روم کا صہیب، حبش کا بلال، اور حجاز کا عمر (رضی اللہ عنہم) ایک وحدت کے غیر منقسم اجزاء بن گئے۔ اور یوں ـــــ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹:۱۰) کی تحیر انگیز تصویر دنیا کے سامنے آگئی ـــ یہی تھی وہ برادری جس کے متعلق جب حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تمام روئے زمین کے مسلمان جسدِ واحد ہیں تو اس سے فی الواقعہ یہ مقصود تھا کہ اگر کبھی پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ اگر افریقہ کے صحرا میں کسی حبشی کے سر میں درد ہو تو ایران کے سبزہ زاروں میں محوِ گلگشت شاہنشاہ کا تاج اس کے لئے وبالِ دوش ہو جائے اگر شام کے میدانوں میں کسی اونٹ چرانے والے کے سینہ پر کسی ناہنجار کا تیر آ لگے۔ تو اس کی انی چین کے محلات میں سونے والے خاقان کے جگر سے نکلے۔ اگر مراکش کے چرواہے کے خیمے کی طناب پر کوئی ظالم ہاتھ ڈالے تو قسطنطنیہ کے قصرِ اجسر کے ستونوں میں تزلزل واقعہ ہو جائے۔ اگر دشتِ حجاز میں کسی بیوہ کے بچے کی طرف کوئی نگاہِ بد سے دیکھے تو تمام عالم اسلامی کی انگلیاں اسکی آنکھ نکال لینے کے لئے بیک وقت اٹھ آئیں۔ یہی وہ اخوت تھی جس نے چند دنوں میں وہ انقلابِ عظیم برپا کر کے دکھا دیا جس پر آج تک دنیا انگشت بدنداں ہے۔ لیکن اس کے بعد اس برادری کے افراد نے اپنی وجہِ جامعیت، یعنی رشتۂ ایمان کو ہاتھ سے چھوڑ دیا، اور محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والے کا نام مسلمان رہ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو نتائج و ثمرات، ایمان سے پیدا ہونے تھے وہ محض نام سے تو پیدا نہیں ہو سکتے۔ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم ان خصوصیات کو جو مومنین کی بتائی گئی ہیں، موجودہ مسلمانوں کا شعار سمجھ کر ان سے غلط توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ اور ان کے پورا نہ ہونے سے کبھی افسردہ خاطر ہو جاتے، کبھی غضب آلود ـــ ہندوستان میں (انگریز کے عہدِ غلامی میں) ہمارے قلوب میں اس اخوتِ اسلامی کی حرارت موجود تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئے، ہم اپنی جگہ تڑپ اٹھتے تھے۔ یہ اثر تھا، قرآن کی اس تعلیم کا جسے سرسید، اور اقبالؒ نے ہمارے سامنے (از سرِ نو) پیش کیا تھا۔ اسی تعلیم کو ہم نے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد قرار دیا تھا ـــ یعنی اس اصول کو کہ تمام مسلمان، بربنائے اشتراکِ ایمان، ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ اور غیر مسلم، دوسری قوم کے افراد ـــــ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد حالات کچھ مختلف ہو گئے،

کیونکہ اب جذبات کے بجائے حقائق کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ہمیں کبھی بعض اوقات سیاسی مصالح کو پیش نظر رکھکر دیگر ممالک سے تعلقات کے فیصلے کرنے پڑے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ "اخوت" دو بھائیوں میں ہوتی ہے۔ یہ وہ تالی ہے جو ایک ہاتھ سے بج ہی نہیں سکتی۔ اگر آپ جذبۂ اخوت سے پیش آئیں اور فریقِ مقابل کی طرف سے اس کا ردِ عمل اس کے خلاف ہو، تو اس طرح رشتۂ اخوت قائم رہ نہیں سکتا۔ یہ تو دو طرفہ یکساں ردِ عمل کی بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تمام ممالکِ اسلامیہ کا آئین و دستور ضابطۂ خداوندی (قرآنِ کریم) پر مبنی ہو۔ وحدتِ عمل کی محکم بنیاد، وحدتِ فکر ہوتی ہے۔ اور وحدتِ فکر کا دوسرا نام آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔ اِس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ مختلف اسلامی ممالک تو ایک طرف کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان بھی آپس میں بھائی بھائی نہیں ہیں ـــــ ان کے مفاد الگ الگ ہیں۔ ان کے مقاصد جدا جدا ہیں۔ ان کی راہیں متفرق ان کی منزلیں متشتت ہیں۔ ان کی ہیئتِ اجتماعیہ ـــــ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّ قُلُوبُهُمْ شَتّٰى۔ (تم خیال کرو گے کہ یہ سب ایک ہیں، حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں) کا عبرت انگیز مرقع ہیں۔ جو کیفیت کسی ایک ملک کے مسلمانوں کی ہے، وہی کیفیت مختلف ممالک کے مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات کی ہے۔ ان تعلقات کے لئے انہیں باہمی سیاسی، تجارتی اور ثقافتی معاہدات کی ضرورت اسی طرح لاحق ہوتی ہے جس طرح غیر مسلم ممالک کو باہمی تعلقات کی استواری کے لئے، یا کسی مسلم ملک کو غیر مسلم قوم کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی خاطر۔ مسلم ممالک کے باہمی تعلقات، باہمی معاہدات کی حد تک محدود ہوتے ہیں ـــ حالانکہ اخوت کے بعد معاہداتی تعلقات کا تصور ہی بے معنی ہے ـــــ اور جن ممالک میں اس قسم کے معاہدات نہیں ہوتے ان میں باہمی تعلقات کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کی یہی اجتماعی کیفیت تھی، جسے بطورِ دلیل پیش کر کے (مولانا) ابوالکلام آزاد نے، اپنی زندگی کے آخری سانس میں، خود نفسِ اسلام کے خلاف یہ کچھ کہنے کی جرأت کر لی تھی کہ۔

اسلام نے اشتراکِ ایمان کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کی کوشش کی،
لیکن اس کا یہ تجربہ ناکام رہ گیا۔

حالانکہ یہ شخص اپنے دل کی گہرائیوں میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ اسلام کی ناکامی نہیں تھی جب مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا تھا، تب یہ کیفیت پیدا ہوئی تھی ـــ بہرحال ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس باب میں ہمیں جذبات سے بلند ہو کر حقائق کا سامنا کرنا چاہیئے اور وہ "حقائق" یہ ہیں کہ

چونکہ مسلم ممالک کا آئین، ضابطۂ خداوندی پر متفرع نہیں، اس لئے ان میں اخوتِ اسلامی بھی موجود نہیں۔ اور جب یہ اخوت ہی موجود نہیں تو اس اخوت کے جذبہ کو اپیل کر کے، مسلم ممالک کو کسی خطرہ کے مقابلہ کے لئے دعوتِ اتحاد دینا، مایوسی کو پکارنے کے سوا اور کیا ہے؟ یہ عجیب تماشا ہے کہ مسلمانوں کی تو باہمی کیفیت یہ ہے۔ لیکن غیر مسلم قوتیں، مسلم ممالک کے درپئے تخریب اس لئے رہتی ہیں کہ یہ (اُن کے خیال میں) اسلام کے علمبردار ہیں اور کوئی غیر مسلم قوم شجرِ اسلام کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتی۔ اسلام کے خلاف ان کے اتحاد کا اندازہ اس سے لگائیے کہ عیسائیوں کی سب سے زیادہ شدید عداوت یہودیوں کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ یہ عداوت ان کے ایمان کا جزو بنی۔ کیونکہ ان کا دعوے تھا کہ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کو حوالۂ صلیب کرایا تھا۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ چند سال ادھر سے عیسائیوں میں یہ تحریک پھیلائی جارہی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی تصلیب میں یہودیوں کا ہاتھ نہیں تھا۔ اس کی واحد مجرم رومن حکومت تھی۔ چنانچہ اب ان کے ہاں تاریخ کو بدلا جارہا ہے اور حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب کو نئے رنگ میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ تمام کوششیں، یہودیوں کی اسرائیل حکومت کو تقویت پہنچانے کے لئے بروئے کار لائی جارہی ہیں۔ ان سازشوں کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے اس کے متعلق کسی پیش گوئی کی ضرورت نہیں۔

اور ان سازشوں کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلم ممالک قرآن کریم کو اپنی مملکتوں کا آئین قرار دیں۔ اور اس طرح پھر سے اس رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جائیں جو اشتراکِ ایمان کا فطری نتیجہ ہے۔ اس کی ابتدا پاکستان سے ہونی چاہیئے۔ جس کی وجہ جواز ہی اشتراکِ ایمان کی بنا پر قومیت کی تشکیل ہے۔ اور مقامِ مسرت ہے کہ صدر ایوب نے شاہ حسین کے سامنے اپنی بلا شروط امداد کی پیشکش کر کے، اس سبقت کا نہایت مبارک ثبوت پیش کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اُردن کو واقعی اس امداد کی ضرورت لاحق ہو گئی تو حکومتِ پاکستان ہی نہیں بلکہ اس کے عوام بھی اس میں بدل و جان برابر کے شریک ہوں گے۔ اس لئے کہ سیاسی تغیرات کے باوجود ان کے دل میں اخوتِ اسلامی کی چنگاری بدستور روشن ہے۔ اور یہی وہ حرارت ہے جو ہمیں دیگر اقوام سے متمیز کرتی ہے۔

طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ میں **"محشرستانِ فلسطین"** کے عنوان پر ایک مفصل مقالہ شائع ہوگا جس میں فلسطین کی تاریخ اور اسرائیلی ریاست کے پس منظر پر سیر حاصل بحث ہوگی

خورشید عالم

"چین" کا عالمی کردار - ۲

انقلابِ چین کو عالمی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کے لئے یورپی ذہنیت کو خصوصیت سے پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یورپ نے اپنی تہذیب کو نئی روشنی کہا، کہلوایا اور بہ لطائف الحیل منوایا۔ ملکوں ملکوں میں ابتدائی درجوں میں بچوں کو پڑھوایا اور رٹایا گیا کہ یورپ یہ روشنی لے کر نہ آتا تو ان کے ہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا۔ علوم سائنس اور علوم عمرانی میں ایک ہی رٹ لگائی گئی کہ یہ سب مغرب کی سعی و کاوش اور جود و عطا ہے۔ افریقہ کے متعلق یورپ نے اس سے بہتر تاثر نہ دیا کہ وہ ایسا تاریک جنگل ہے جو قبل از تہذیب کے انسان نما حیوان سے معمور ہے۔ ایشیا، افریقہ سے ایک قدم آگے ہی سہی لیکن جہالت اور پسماندگی کا گہوارہ ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں سفید فام افرنگی چار سو چھپٹتا رہا۔ اپنی تہذیب کے بارِ گراں سے اس نے ایک ایک ملک، اور ایک ایک قوم کی کمر توڑی۔ اقوام و ممالک کو بے دردی سے لوٹا اور بے دریغی سے تباہ کیا۔ ان کی تہذیب و تاریخ کو غایت بے حمیتی سے مسخ کیا۔ سب کی خوبیاں اپنے نامۂ اعمال کی زینت بنائیں اور اپنی سیہ کاریوں کو ان کے گلے کا طوق بنا دیا۔ فرنگی ٹکسال میں سکے تو سر تا سر نفرت کے ڈھلتے تھے، لیکن ان پر ٹھپہ تہذیب اور شرافت کا لگتا تھا۔ تہذیب کی جو پٹاری یورپ لے کے نکلا اس سے وہ نفرت کے لہراتے بل کھاتے سانپ نکلے جنکے سامنے اخلاق و اقدار دم توڑ گئیں۔ گذشتہ دو صدیاں کہ انہیں بجا طور پر عہدِ یورپ کہا جا سکتا ہے، تاریخ انسانی کا گھناؤنا باب ہیں۔ افرنگ مشین کے زور پر اٹھا اور آگے بڑھا۔ وہ مشین کا ایک راکب نہیں مرکب بھی تھا۔ اس نئی قوت کو اس نے اپنا معبود بنا لیا، بالکل اس ابتدائی انسان کی طرح جس نے پتھر اٹھایا، اپنے ہاتھ سے اس کے خد و خال تراشے اور اسے سامنے رکھ کر اسے پوجنے بیٹھ گیا۔ وہ انسان عناصرِ فطرت کو سمجھتا بھی نہیں تھا، اور از روئے جہالت ان سے سہما ہوا بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں ان قوتوں پر حکومت کرنے والا افرنگی ترقی یافتہ بھی تھا اور علم و حکمت کا دعویدار اور اجارہ دار بھی۔ اس کے باوجود وہ مشین کے دیوتاؤں سے ایسا مرعوب ہوا

کہ تمام تر اقدار انسانی کو اس کی بھینٹ چڑھا دیں۔ دو سو سال تک اس نے استحصال اور سلب و نہب کا بازار بے کھٹکے گرم رکھا۔ یورپ کے کردار کو دیکھ کر انسان اور حیوان کے ارتقاء کا عجیب تضاد سامنے آتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کرۂ ارض پر قوی ہیکل اور مہیب جانور پائے جاتے تھے۔ وہ بتدریج ناپید ہوتے گئے اور ان کی جگہ چھوٹے اور کم مضرت رساں جانور نمودار ہوتے گئے۔ اس کے برعکس انسان کا آغاز بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں ہوا۔ کہیں صدیوں میں جا کر اس نے پتھر کو اوزار حملہ کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ لیکن تہذیب کا نام نہاد علمبردار فرنگی آلاتِ ہلاکت میں روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ اب وہ پرلے درجہ کا دیو ہیکل جانور بن گیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ، البتہ کہ اس جانور نے دوسرے جانور ڈستے ہوں گے، لیکن یہ اپنے آپ سے سہم گیا ہے۔ یہ تہذیب فرنگ کا کمال ہے کہ دو عالمگیر جنگوں کی ہولناک تباہ کاریاں بھی اس کی رفتارِ ترقی کو روک نہ سکیں۔ اور اب اس تہذیب نے بحر و بر اور فضا اور خلا میں ہلاکت کے جو سامان کر رکھے ہیں، ان کے نتائج کے تصور سے عہدِ حاضر کے انسان کی روح قبض ہوتی ہے۔

جو تخمِ خبیث یورپ بوتا چلا آیا ہے، اس کی فصل دنیا کے گوشے گوشے میں پکنے لگی ہے۔ اس سیلابِ بلا کا سارا رُخ چین کی طرف موڑا جا رہا ہے۔ مغرب بزعمِ خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ چین کا گھر پھونک کر تماشہ دیکھے گا بھی اور ایک عالم کو تماشہ دکھائے گا بھی۔ لیکن تاریخ کی چشمِ اشکبار اب واضح طور پر دیکھنے لگی ہے کہ جس گھر کے بے جانے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں اور سامان کئے جا رہے ہیں، وہ چین کا نہیں یورپ کا اپنا گھر ہے۔ دو عالمی جنگوں سے بچ جانے، مگر منہدم نہ ہونے والے اس گھر کے پوری طرح مسمار ہو جانے کے قطعی آثار ایشیا میں پیدا ہو رہے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ آنے والا فیصلہ کن زلزلہ چین ہی کے کسی گوشے سے نمودار ہوگا۔ اقبالؔ کی پیش گوئی کے مطابق یہ تہذیب یورپ کی خودکشی ہوگی۔ خنجر نتائج اعمال کا ہوگا۔ اور ہاتھ ایشیا کا۔

کوئی دو سو سال تک یورپ عالمی اعصاب پر اس بری طرح سوار رہا کہ وہم و گمان میں کبھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ زوال آشنا ہوگا۔ اس صدی میں پہلی بار یہ سوچنے کی گنجائش پیدا ہوئی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ موقع اس وقت آیا جب جاپان، اور روس، چین کے شمال مشرق میں مانچوریا کے علاقے پر نظریں جمائے باہم دست و گریباں ہوئے۔ اس تصادم میں جاپان نے روس کو شکست دی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک ایشیائی ملک نے ایک یورپی طاقت کو پچھاڑا تھا۔ ایشیا میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، لیکن یہ لہر تا دیر باقی نہ رہ سکی۔ ایشیا نے جو توقعات اس سے باندھی تھیں، جاپان نے ان کا آئینہ جلدی ہی سربازار پاش پاش کر دیا۔ اس کا مطمحِ نظر چین تھا۔ اور وہ روس اور دیگر مغربی اقوام کے مقابلے میں خود اندرونِ چین غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی اقوامِ مغرب

کی طرح استعماری قوت بن کر چین کے درپے ہو گیا۔ جاپان کی دست اندازی اور دراز دستی بلاواسطہ طور پر چین کے لئے اور بالواسطہ طور پر ایشیا کے لئے نیک فال ثابت ہوئی۔ جاپان کی جارحیت نے اس انقلاب کی رفتار کو تیز تر کر دیا جس کا مواد ایک عرصے سے چین کے اندر تیار ہو رہا تھا۔ چین کی قیادت جاپان کے طوفانِ بلاخیز کی حریف بننے سے قاصر رہ گئی، تو چین کی گہرائیوں سے قیادت کا وہ دھارا پھوٹا جو جارحیت کو بہا لے گیا اور چین کو جل تھل کر گیا۔ جن مخصوص حالات اور پس منظر میں یہ انقلاب آیا، اس سے یہ مقامی ہوتے ہوئے بھی عمومی حیثیت اختیار کر گیا۔ گویا یہ چینی بھی ہے، ایشیائی بھی اور عالمی بھی — یہ چینی اس حد تک ہے کہ چین کے اندر سے ابھرا۔ اور براہِ راست نتیجہ ہے اس کشمکش کا جو اندرونی اور بیرونی عوامل نے اندرونِ چین پیدا کر دی تھی۔ ان معنوں میں یہ انقلاب ایشیائی ہے کہ اپنے نظامِ کہن کو خیرباد کہتے ہوئے چین للکار کر استعمارِ فرنگ کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ کے ٹوٹنے کی یہ واضح تمہید ہے۔ یہی اس کے عالمی ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا حریف امریکہ ہے جو ناخواندہ چینی قیادت کا پشت پناہ بن کے آ دھمکا تھا۔ اور اب ایشیا کی بیداری کے سیلِ بے پناہ کے آگے اس دھول کے انبار جمع کر رہا ہے جو تاریخ کے اٹھتے طوفان کی جلو میں اڑ اڑ کر اس کی آنکھوں کو اندھا کئے جا رہی ہے۔

جاپان کی بیداری اور روس پر فتح کو ایشیا اپنا کہتے کہتے ٹھٹھک گیا تھا، لیکن چین کی بیداری کا ردِ عمل مختلف ہوا اور ہو رہا ہے۔ چین کے انقلاب میں نہ جاپان کی جارحیت آئی، نہ روس کی مغربیت، اور نہ مغرب کی استعماریت۔ انقلابی قیادت نے فکر و عمل کی جو طرح ڈالی، اس نے اندرونِ چین ایسے حیران کن نتائج پیدا کر دکھائے کہ تہذیب یورپ کی چکی میں پسنے والی اقوامِ مشرق کے لئے دعوتِ فکر بھی بن گئی اور مہمیزِ عمل بھی۔ چینی انقلاب نے رنگ تو اشتراکیت کا اختیار کیا، لیکن اس کا سرچشمہ پھوٹا چین کی روح کی گہرائیوں سے ہی۔ داعیانِ انقلاب نے جب دیکھا کہ برسرِ اقتدار نیشنلسٹ طائفہ جاپانی جارحیت کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہ گیا ہے تو وہ اپنے درماندہ کارواں کو لے کے آگے بڑھے۔ اٹھے تو وہ جاپانی جارحین کو اپنے وطن سے نکال دینے کے لئے، لیکن ان کا مقابلہ اپنی حکومت سے بھی آ پڑا، جو چین کی ظلمتِ شب کے سینے سے پھوٹتی کرن کو بے نور کر دینا چاہتی تھی۔ چین کی رات کو اور تیرہ و تار کرنے کے لئے امریکی اندھیروں نے بھی ہجوم کیا۔ اس طرح بے سروسامان انقلابیوں کو تین حریفوں سے نپٹنا پڑ گیا۔ ایک اپنی حکومت، دوسرا اپنی حکومت کا پشت پناہ امریکہ اور تیسرا جاپان — اس اندھا کرتے مقابلے سے انقلابیوں کی مثال گویا ان ایمان والوں کی سی ہو گئی جن کے لئے بشارت ہے کہ وہ مصائب سے دوچار ہوتے ہیں تو اپنے اعلیٰ و ارفع نصب العین کے تصور سے اپنے عزمِ سفر کو تازہ تر کر لیتے ہیں۔ اور جان، مال، اولاد،

املاک کی قربانی کو ثبات و استقلال سے برداشت کرتے ہیں۔ انقلابیوں نے غیر معمولی برداشت کا ہی مظاہرہ نہیں کیا، بہت اعلےٰ کردار کا بھی ثبوت دیا۔ چینی انقلاب بیسویں صدی کا معجزہ ہے۔ اس صدی میں جو انقلابات آئے، ان کے مضمرات سے مجالِ انکار نہیں۔ لیکن ان کا مقابلہ چین سے نہیں کیا جا سکتا۔ روس میں انقلاب آیا، ترکی میں انقلاب آیا، اس برصغیر میں انقلاب آیا۔ ان انقلابات کے جو نتائج سامنے آئے، پیش از انقلاب ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روس نے اپنے ہاں بھی حیران کن نتائج پیدا کر دکھائے اور اقوامِ عالم کے فکر و عمل پر بھی گہرا اثر کیا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یوں نظر آنے لگا کہ گاڑی پٹڑی سے اتر گئی ہے یا کانٹا ایسے بدل گیا ہے کہ وہ کسی اور ہی سمت کو چل نکلی ہے۔ ترکی اور پاکستان نے بہت بڑے انقلابات برپا کئے۔ پچھلے شمارے میں ان کی اہمیت ایک حد تک بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن دونوں ۔۔۔ بھٹک رہے ہیں ابھی میرِ کارواں کے لئے ۔۔۔ ستاروں پر کمندیں پھینک کر وہ راستے کے پتھروں پر ٹپخنیاں کھا رہے ہیں۔ اور تو اور، الجزائر کے مجاہدین، جنہوں نے فرانس جیسی قہرمانی قوت کو شکست دے دی، آزادی کی پہنائیوں میں کھوئے کھوئے پھر رہے ہیں۔

ان کے برعکس جوانانِ چینی صاحبِ نظر ہی نہیں، مردانِ کار بھی نکلے۔ وہ تصور میں یکتا اور عمل میں منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ یہ واحد قوم ہے جس کے ہاتھ کی سب لکیریں رگِ جان بنی نظر آتی ہیں۔ چین نے یورپ کی طرح اپنی دعوت اور اپنی جد و جہد کی بنیاد نفرت یا دیگر منفی محرکات پر نہیں رکھی۔ اس نے خودی کی پرورش کی، اور لذتِ نمود کو اپنا شعار بنایا۔ ہم نے سنا اور چین نے کر دکھایا کہ غلامی سے امتوں کی نجات "خودی کی پرورش اور لذتِ نمود میں ہے!" ان کا واحد دوست روس تھا۔ اس دوست سے چین نے استمداد کی لیکن اس کا دریوزہ گر نہیں ہوا۔ کسی کا دست نگر ہونا مزاجِ انقلاب کے خلاف تھا۔ چین اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا گیا۔ امریکہ اس کے دامن کو حریفانہ کھینچنے سے گریز کرتا تو چین ایک عرصہ تک اپنے من میں ہی ڈوبا رہتا۔ لیکن شاید مشیت کچھ عجلت میں ہے ۔۔۔ "کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون" ۔۔۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے انسان کا دستِ تعاون حاصل کرنے کے لئے کچھ بے تاب دکھائی دے رہی ہے۔ فطرت کے مقاصد کا معیار کس کے ارادے بنتے ہیں اور کب، یہ تو ہنوز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہ، اپنی میزان جلدی جلدی نصب کرنے میں لگی دکھائی دیتی ہے۔ "آوازۂ حق" سنائی دینے لگا ہے۔ دیکھیں لبیک کی صدا آتی ہے "کب اور کدھر سے"۔

امریکہ منہ کی کھا کر چین سے نکلا تو دنیا بھر میں یہ ڈھنڈورہ پیٹا گیا کہ چین جیسا مفلوک الحال ایشیائی ملک آج کی ترقی یافتہ اقوام کی محفل میں بار پا سکنے کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ زیادہ سے

زیادہ روس کے کھونٹے پر ہی ناچ سکتا ہے اور اسی کا طفیلی بن کے ہی رہ سکتا ہے۔ بظاہر بات تھی بھی ٹھیک کیونکہ ستر کروڑ کی آبادی کے لئے رہائش، لباس، خوراک اور تعلیم کا انتظام دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے بس کی بھی بات نہیں تھی۔ امریکہ نے اپنے پیمانوں کو دیکھ کر یہی فیصلہ صادر کیا کہ چین انہی مبادیات میں الجھا رہے گا اور روس اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر اسے اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کرے گا۔ ایک وقت تک ایسا ہی دکھائی دیتا رہا کہ چین کی چاندنی روسی سورج ہی کی دین ہے لیکن چین نے یہ اندازے اپنے عمل سے یکسر غلط ثابت کر دیئے۔ چین کا نیا دور ۱۹۴۹ء میں شروع ہوا۔ اور ۱۹۶۰ء میں روس اس کی ہر طرح کی مدد بند کرنے پر آ گیا۔ اس پر دشمنانِ چین کے ہاں گھی کے چراغ جلے اور یہ یقین کر لیا گیا کہ چین کے انقلاب کا بھرم بالآخر کھل گیا ہے۔ چین کو صرف روس کی امداد حاصل تھی اور اس نے اپنا ہاتھ روک لیا ہے تو چین کیا تیر مارے گا۔ بھارت کا چین پر حملہ بھی اسی احمقانہ خوش خیالی کا نتیجہ ہی تھا اور اس کی تصدیق کی خطرناک صورت بھی۔

روس کے ساتھ چھوڑنے سے چین بے یار و مددگار رہ گیا لیکن اسی سے اس کے اصلی جوہر کھلے۔ روسی امداد کے بند ہو جانے کے بعد چین نے اس قدر ترقی کی ہے کہ اسے تسلیم کرنا آسان نہیں۔ پانچ چھ سال کی قلیل مدت میں چین ایٹمی دھماکوں کے کئی تجربے کر چکا ہے۔ گو معاندین ابھی تک تسلیم کرنے کے لئے یہ تیار نہیں کہ چین نے واقعی اتنی ترقی کر لی ہے جتنی قرائن سے ظاہر ہوتی ہے تاہم اس میں بالکل شبہ نہیں رہا کہ وہ ایٹمی اور نواتی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ چین واحد ایشیائی ملک ہے جس نے مغرب کو ایٹمی محاذ پر للکارا ہے۔ اس کی للکار کہیں زیادہ مہیب اس لئے ہو جاتی ہے کہ اس نے ایٹمی ترقی کسی مغربی قوم کی مدد کے بغیر کر لی۔ امریکہ ایک طرف بربنائے حقارت اس ترقی کا استخفاف کرتا ہے اور چین کے ایٹمی دھماکوں کو کھلونوں سے تشبیہ دیتا ہے اور دوسری طرف اس خدشے کا اظہار برملا کرتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ چین نے اس میدان میں اس سے کہیں زیادہ ترقی کر لی ہو جس کا امریکہ جاسوسی کے زمینی اور خلائی وسائل سے پتہ چلا سکا ہے۔

مغرب کو ایٹمی اجارہ داری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور سمجھتا ہے کہ اسی خوفناک طاقت کے زور پر ہی وہ اپنی برتری منوا سکے گا اور بالادستی برقرار رکھ سکے گا۔ چنانچہ امریکہ نے بڑے جتن کئے کہ غیر ایٹمی بالخصوص ایشیائی اقوام ایٹمی قوت کے راز سے ناآشنا لہٰذا اس کے رحم و کرم پر رہیں۔ چین نے اس کی اجارہ داری ختم کر کے اس کے پندار کا خم کدہ ویران کر دیا ہے۔ چین نے یہ سب کچھ اپنے زور پر اور اپنے آپ کیا ہے۔ درحقیقت اس کی ترقی کا راز اسی میں ہے کہ اس نے کسی پر تکیہ نہیں کیا اور اپنے تیشۂ فکر سے اپنا جادۂ عمل

خودنراشا۔ اس میں غیر یورپی اقوام کے لئے واضح نشانیاں ہیں۔ چین کی طرح وہ بھی اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا تہیہ کرلیں تو وہ یورپ کی استحصالی امداد سے بے نیاز ہو جائیں گی اور ان کی رفتار ترقی غیر معمولی طور پر تیز ہو جائے گی۔ چین کی مثال کو سامنے رکھنے اور اس کا تجزیہ کرنے سے بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں۔ کسی کو ان کی آئیڈیالوجی یا نصب العین سے اختلاف ہو تو ہو، لیکن اس حقیقت سے کسے مجالِ انکار ہے کہ ان کا کعبۂ مقصود اس قدر واضح اور لیں سامنے رہنے لگا ہے کہ انہیں سمت کا تعین کرنے کے لیے کسی "قبلہ نما" کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ جدھر منہ کرتے ہیں بلحواتے " فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ " ان کا نصب العین ان کے سامنے ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس حد تک اپنے نصب العین سے ہم آہنگ کرلیا ہے کہ ان کا جینا، اور ان کا مرنا اسی نصب العین تک پہنچنے کے لئے وقف ہو کے رہ گیا ہے۔ انقلاب ان کے ہاں کہنے کی بات نہیں رہی، نہ تبدیلی چند افراد تک محدود ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ سارے کے سارے کلیتہً ایک ہی رنگ میں رنگے گئے ہیں۔ اور — فَادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً — کے مطابق انہوں نے پورے کے پورے نظام کو اپنے اوپر پوری طرح وارد کرلیا ہے۔ اس سے ان کی زندگی کا سارا چلن بدل گیا ہے —
قومیں شمشیر و سنان لے کے اٹھتی ہیں لیکن طاؤس و رباب لے کے بیٹھ جاتی ہیں اور پھر اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ چین کے ایک ہاتھ میں شمشیر و سنان ہیں اور دوسرے میں طاؤس و رباب۔ وہ رباب کی نزاکت اور لطافت سے وہی کام لیتا ہے جو شمشیر کی تیزی اور کاٹ سے لیتا ہے۔ چین کے مغنی تمام مراحل ہنر طے کر کے دل کی اس رمز کو سمجھ گئے ہیں کہ "اصل اس کی نے نواز کا دل ہے نہ چوب نے"۔ اس نے شمشیر و سنان اور طاؤس و رباب کے اول و آخر کی بحث ختم کر دی ہے۔

یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ چین کا انقلاب زیرِ سطح قوتوں کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس قوم کا شعور تک انقلاب سے متأثر اور ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے عمل کے پیمانے اس کے مطابق ڈھالے اور عمل کے زور سے ہی انقلاب کی خوبیاں اپنے ہمسایوں تک پہنچا رہے ہیں۔ یورپ اس "تبلیغ" کے لئے نکلا تھا، تو اس کے سر میں استعماریت کا سودا اور اس کا ہمزاد نفرت کا خناس تھا۔ اس نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی استحصال سے کام لے کر غیر یورپی اقوام کو ہر قسم کے ورثے سے محروم کر کے تاریخی یتیم بنا دیا۔ یہ اقوام آج جن مصائب سے دوچار ہیں، وہ اس غیر انسانی سلوک کا براہ راست نتیجہ ہیں، جو یورپ نے کم و بیش دو سو سال ان سے روا رکھا۔ اور جسے بدلنے کے لئے وہ اب بھی تیار نہیں۔ یورپ کے مقابلے میں روس کے انقلاب سے یہ خوش فہمی پیدا ہوتی تھی کہ اس کی حیثیت تصوراتی ہے۔ نسلی، قومی یا علاقائی نہیں۔ ایک عرصہ یہ تأثر قائم بھی رہا، اور اشتراکیت کو روسیت سے الگ سمجھا جاتا رہا۔ لیکن یہ انقلاب

بھی یورپی سواحل میں گھر بچھلا جا رہا ہے چین کے انقلاب نے ایکبار پھر ایشیائی بلکہ غیر یورپی توقعات کو بیدار کر دیا ہے۔ ابھی تک چین کے انداز اور اطوار سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا انقلاب تنگ نظر انہ ہے۔ وہ اعلانیہ مخالفت کرتا ہے اور غیر مصالحانہ رویّہ اختیار کرتا ہے تو صرف دو امور کے بارے میں۔ ایک، استعماریت اور دوسرا اصولِ انقلاب سے انحراف۔ پہلے کا نمائندہ امریکہ ہے اور دوسرے کا روس۔ اسی لئے اس کی دونوں سے نہیں بنتی اور وہ ایک ہی سانس میں دونوں کا ذکر کر جاتا ہے۔ لیکن روس اور امریکہ چین کو اپنے پیمانوں سے ناپتے ہیں اور جو کچھ وہ خود کرتے چلے آ رہے ہیں، وہی کچھ وہ کہتے ہیں کہ چین کرے گا۔ امریکہ سرے سے اشتراکیت ہی کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں اور روس اشتراکیت کا مرکز خود ہی بنا رہنا چاہتا ہے۔ امریکہ چین پر یہ الزام دھرتا ہے کہ وہ اشتراکیت برآمد کر کے دوسرے ممالک میں بھیج رہا ہے اور روس چین کو اس بنا پر بُرا کہہ رہا ہے کہ وہ اشتراکیت کی من مانی تعبیر کر رہا ہے۔ یعنی یہ وہی کردار ہے جو "دین سے برگشتہ ہونے والی" مذہبی پیشوائیت دین کی طرف دعوت دینے والوں کیخلاف الحاد و ارتداد کے فتاوے صادر کر کے، سرمایہ داری کے ہاتھ مضبوط کرنے کی خاطر ادا کیا کرتی ہے۔

تہذیب کے یہ اوزار چین کو چیلنج یا چاج سمجھنے میں معذور ہیں۔ لیکن اس سے بین الاقوامی کشیدگی کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ایک چین کا راستہ روکنے کے لئے سبھی ملی بھگت کرتے جا رہے ہیں۔ بین الاقوامی میدان میں ان کے کردار کا نقطۂ ماسکہ چین دشمنی اور مزاحمتِ چین بن گیا ہے۔ نیویارک میں اقوامِ متحدہ ہال ہو یا کوریا اور ویٹ نام کے عرضِ بلدِ تقسیم، خلفشار زدہ افریقہ کے ملک کانگو میں ہو یا جنیوا کی تحدید اسلحہ کانفرنس میں، بہت سی باتوں کی تان بلاواسطہ نہیں تو بالواسطہ چین پر ہی آ کے ٹوٹے گی۔ امریکہ اپنے ہاں، چین کے اندر، اقوامِ متحدہ میں، کوریا میں، ویٹ نام میں، بزعمِ خود چین ہی کے خلاف لڑ چکا ہے یا لڑ رہا ہے۔ ایک عرصہ سے وہ روس کو بھی ساتھ ملاتا چلا آ رہا ہے۔ چین کا ایشیائی ہونا اور اس کا روس سے سرتابی کرنا ماسکو کے قائدینِ اشتراکیت کے نزدیک ناقابلِ برداشت ہے۔ اس منفی بنیاد پر وہ امریکہ سے قریب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جو کھلے خنجر وہ ایک دوسرے کے خلاف لہراتے رہے ہیں، وہ آستینوں کے اندر ہوتے جا رہے ہیں، ہاتھ سے چھوٹے نہیں جا رہے۔ وہ اسی حال میں بھارت کے محاذ پر بغلگیر ہوتے دکھائی دیتے ہیں — آستین کے اندر چلے جانے والے خنجر کی دھار ویسی ہی تیز ہے جیسی کہ تھی۔ نیت بھی دونوں کی سوچا مرتبہ سے مختلف نہیں۔ بھارت کے محاذ پر یہ خنجر کس کے خلاف استعمال ہونگے، اور کیسے؟ — اس پر گفتگو آئندہ کی جائے گی۔ انشاء اللہ!

باسمہٖ تعالیٰ

"گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا"

ماؤزے تنگ اور قرآن

کمیونزم کے فلسفۂ زندگی اور قرآنی فلسفۂ حیات کا

تقابلی جائزہ

پرویز

شائع کردہ
ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

ماؤزے تنگ اور قرآن

پرویز

اسلام ایک دین ہے۔ دین کے معنی ہیں ایسا نظامِ زندگی جس کی بنیاد کسی فلسفۂ حیات (Ideology) پر ہو۔ وہ کوئی مذہب (RELIGION) نہیں۔ مذہب کا تعلق نظامِ زندگی سے ہوتا ہی نہیں۔ وہ دنیاوی کاروبار سے الگ تھلگ رہنا سکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے کسی نظامِ حیات کو جنم نہیں دیا۔ یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں جو انسان کو مکتی یا نجات کے طور طریق سکھاتے ہیں۔ کوئی نظامِ زندگی عطا نہیں کرتے۔ دوسری طرف، (اسلام کے علاوہ) کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جو کسی فلسفۂ حیات کی بنیاد پر استوار ہو۔ یعنی مذاہب عالم میں سے کسی کو نظامِ زندگی سے تعلق نہیں۔ اور کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جس کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہو۔ اسلام کے بعد کمیونزم ایک ایسا نظامِ زندگی ہے جو ایک فلسفۂ حیات پر متفرع ہے۔ بالفاظِ دیگر، صرف کمیونزم ایک "دین" کی حیثیت سے اسلام کے مدِمقابل آیا ہے۔ اس لئے اسلام کو ایک دین ماننے والوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کمیونزم کا اس نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کریں۔ اور پھر دیکھیں کہ ان میں سے کون سا ایسا نظامِ زندگی ہے جو انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اور اس میں باقی رہنے اور آگے چلنے کی صلاحیت ہے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں نے بالعموم اسلام کو ایک مذہب سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے وہ اس کا مقابلہ مذاہبِ عالم سے کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف کمیونسٹوں کو بھی بالعموم اتنا ہی معلوم ہے کہ کمیونزم ایک معاشی نظام کا نام ہے۔ حالانکہ (جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے) یہ ایک نظامِ زندگی ہے جو ایک خاص فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے، عصرِ حاضر میں، انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے مستقبل کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسلام اور کمیونزم کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہے

میں سمجھتا ہوں کہ اِس وقت دُنیا میں اس سے زیادہ اہم موضوع کوئی ہے ہی نہیں۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکا ہوں۔ کہ

(۱) ایک چیز ہے کمیونزم کا فلسفۂ حیات اور دوسری چیز ہے اس کا معاشی نظام، جسے وہ اُس فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کرنے کا مدعی ہے۔

(۲) جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ قرآن کریم کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن کمیونزم کا فلسفۂ زندگی اور قرآن کا فلسفۂ حیات، ایک حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود اصل و بنیاد کے رُو سے، ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

(۳) کمیونزم کا فلسفۂ حیات بنیادی طور پر اس قدر کمزور ہے کہ اس کے پیش کردہ معاشی نظام کی عمارت اس کی بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے برعکس،

(۴) اس معاشی نظام کی عمارت صرف اس فلسفۂ حیات پر قائم ہو سکتی اور برقرار رہ سکتی ہے، جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔

میں نے متعدد مقامات پر ان ہر دو فلسفہ ہائے زندگی کے اصولی خطوط کو سامنے لا کر بتایا ہے کہ یہ کس طرح باہمد گر متضاد ہیں لیکن عصرِ حاضر کے اس اہم ترین مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب کا تقاضا ہے کہ تفصیل سے بتایا جائے کہ یہ دونوں فلسفے کیا ہیں، کس حد تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کہاں سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ احباب کے اس تقاضا کے قطع نظر مجھے خود اس کا احساس ہے کہ یہ موضوع تفصیلی گفتگو کا محتاج و مستحق ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ فلسفیانہ بحث کو عام فہم انداز میں پیش کرنے اور اسے ایک مقالہ میں سمٹانے کی دقت میری عناں گیر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مباحث کے لئے موزوں یہی ہوتا ہے کہ یا تو اُسے متعدد خطبات کی شکل میں درسًا درسًا سامنے لایا جائے اور یا انہیں مبسوط تصنیف کی صورت میں پیش کیا جائے۔ لیکن چونکہ ان باتوں کا سرِدست امکان نہیں، اس لئے میں نے (بحالاتِ موجودہ) یہی مناسب سمجھا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کروں اور تفصیل کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

کمیونزم کا فلسفہ

کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی ابتدا ہیگل سے کرنی چاہیئے اور پھر مارکس اور لینن کو ساتھ لیتے ہوئے ماؤزے تنگ

تک پہنچ جانا چاہیئے۔ لیکن یہ راستہ طول طویل بھی ہے اور (فنی اعتبار سے) دشوار گذار بھی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہیگل اور مارکس کے تصورات کے متعلق سرسری اشارات پر اکتفا کیا جائے اور ماؤزے تنگ کے تصور کو تفصیل سے پیش کیا جائے، بالخصوص اس لئے کہ وہی اس دور میں اس فلسفہ کا عظیم علمبردار، اس کے پیدا کردہ انقلاب کا قائد، اور اس کی بنیادوں پر استوار معاشی نظام کا سب سے بڑا داعی و معمار ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ فکر و عمل کے امتزاج کی رو سے دیکھا جائے تو اس وقت دنیا میں اس کا ہمسر کہیں نظر نہیں آئے گا۔

ہیگل نے کہا کہ دنیا میں ایک تصور (IDEA) وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اس میں سے، اس کی ضد ایک اور تصور پھوٹتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پروان چڑھتا ہے، تو پھر ایک تیسرا تصور ایسا پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں باہدگر متصادم تصورات کی صفات کو لئے ہوئے ابھرتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلۂ تصورات آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روحِ عصر (SPIRIT OF THE AGE) اس عمل پیہم کی محرک ہوتی ہے۔

مارکس، اسی مکتبِ فکر سے متعلق تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ تضاد و تغیر، تصورات میں نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے معاشی نظام میں رونما ہوتا رہتا ہے اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) اس کی قوتِ متحرکہ ہے۔

ماؤزے تنگ بھی اصولی طور پر اسی فلسفۂ اضداد کا موید ہے لیکن وہ ہیگل (بلکہ مارکس سے بھی ایک حد تک) اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کے مجموعۂ تحریرات (WORKS) میں مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے، اور اس کی اصل و بنیاد قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) ہے۔ اس کے ماحصل کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کائنات کی نشوونما کے سلسلہ میں، شروع ہی سے دو تصورات شانہ بشانہ چلے آتے نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک تصور وہ ہے جسے عام طور پر ماوراء الطبیعاتی (METAPHYSICAL) کہا جاتا ہے اور دوسرے کو مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) ماوراء الطبیعاتی فلسفہ کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شئے ایک مستقل وجود رکھتی ہے وہ دیگر اشیائے کائنات سے بالکل لاتعلق اور الگ تھلگ ہوتی ہے اور شروع سے آخر تک وہی شے رہتی ہے۔ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ کچھ اور بن ہی نہیں سکتی۔ خارجی عناصر اس پر ضرور اثر انداز

ہوتے ہیں لیکن اس سے اس کے صرف مظاہر میں تبدیلی آتی ہے، اس کی اصل و بنیاد میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی اس کی تبدیلی کمیت کی (QUANTITATIVE) ہوتی ہے — کیفیت کی (QUALITATIVE) نہیں ہوتی۔ جن اشیاء میں کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہ اپنے جیسی چیزیں ہی پیدا کر سکتی ہیں — جیسے آم کی گٹھلی سے آم پیدا ہو جاتا ہے اور بکری کا بچہ آخر کار بکری بن سکتا ہے، کچھ اور نہیں۔ اسی سلسلہ میں نظریۂ ارتقاء کے حاملین (یعنے ڈارون کے متبعین) بھی اتنا ہی بتا سکے ہیں کہ ارتقاء کی رُو سے اشیائے کائنات کی شکل و صورت ہی میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ذات — (ESSENCE) ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہٰذا کائنات میں تخلیق کا عمل، گردشِ دولابی (REPE-TITION) سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی اصول اشیائے کائنات میں کارفرما ہے اور یہی قانون انسانی فکر و تصورات کی دنیا میں — اصل کے اعتبار سے تبدیلی نہ اُن میں ہوتی ہے، نہ ان میں۔

(۳) اس کے برعکس، جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے کائناتی نشو و نما کا تصور یہ ہے کہ

(ا) (i) کائنات کی ہر شے کے اندر، شروع سے اخیر تک، ہمیشہ دو متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے اس باہمی تصادم یا ٹکراؤ کی جہت سے اس فلسفہ کو جدلیاتی (DIALECTIC) کہا جاتا ہے۔

(ب) ان متضاد عناصر میں سے ایک وقت میں ایک عنصر غالب رہتا ہے۔ اسے (PRINCIPAL) کہا جاتا ہے اور دوسرا مغلوب جسے (SECONDARY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے ایک کا پلڑا بھاری رہتا ہے اور دوسرے کا ہلکا — بھاری یا غالب عنصر کی جو کیفیات ہوں، ان کی نسبت سے وہ شے متعارف ہوتی ہے۔

(ج) باہمی تصادم سے، کچھ وقت کے بعد، مغلوب عنصر، غالب ہو جاتا ہے اور غالب عنصر مغلوب۔ اور چونکہ ہر شے کا تشخص، غالب عنصر کی نسبت سے متعین ہوتا ہے اس لئے اس تبدیلی سے وہ شے خود ایک دوسری شے میں تبدیل ہو جاتی ہے — شکل و صورت کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اصل و بنیاد کی رُو سے بھی بالکل ضد یہ شے۔ اس قانون کو وحدتِ تضادات (UNITY OF OPPOSITES) سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو ماؤزے تنگ کے نزدیک عالمگیر اور بنیادی قانونِ کائنات ہے۔

اس مقام پر ایک ابہام ہے جس کی وضاحت، ماؤزے تنگ کی تحریروں میں مجھے نہیں مل سکی بعض مقامات پر اُس نے کہا ہے کہ اس طریق میں، غالب عنصر، مغلوب ہو جاتا ہے اور مغلوب، غالب آ جاتا ہے یعنی دونوں عناصر موجود تو رہتے ہیں، صرف ان کی پوزیشن بدل جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بات یوں نظر

تی ہے کہ یہ متضاد عناصر شروع سے آخیر تک اس شے میں موجود رہتے ہیں۔ اگر عنصر (الف) غالب ہوتا ہے تو وہ شے (الف) بن جاتی ہے اور جب عنصر (ب) غالب آجاتا ہے تو وہ شے (ب) میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ گردشِ دولابی (CYCLIC PROCESS) اسی طرح جاری رہتا ہے اور اس طرح وہ شے (الف) یا (ب) بنتی رہتی ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں بن سکتی۔

لیکن بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ غالب عنصر آہستہ آہستہ کمزور ہوکر مغلوب عنصر میں تبدیل یا مدغم ہوجاتا ہے اور اس طرح اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس نے کئی جگہ اسے اس کی موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح اس شے میں ایک نیا عنصر وجود میں آجاتا ہے جس کی حیثیت عنصر غالب کی ہوتی ہے اور اس کے بالمقابل ایک نیا مغلوب عنصر وجود میں آجاتا ہے۔ یوں وہ شے (الف) اور (ب) میں ہی تبدیل نہیں ہوتی رہتی بلکہ وہ ارتقائی طور پر کچھ اور بن جاتی ہے جو پہلی شے سے ارفع ہوتی ہے۔ اسے تضادات میں توافق کہا جاتا ہے۔

(د) اس عملِ تغیر کی رو سے ایک شے، ایک ہی وقت میں، وہ شے بھی ہوتی ہے اور کچھ اور شے بن بھی رہی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اشیائے کائنات ہمیشہ وجود کوشی (BECOMING) کے مرحلہ میں رہتی ہیں، وانیتیت (BEING) کے مقام تک کبھی نہیں پہنچتیں۔

(س) ایک شے کے اندر دونوں متضاد عناصر ایک دوسرے کی ضد (OPPOSITE) ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کے وجود کا سبب (COMPLEMENTARY) بھی ہوتے ہیں۔ یعنی اگر ان میں سے ایک کا وجود نہ ہو، تو دوسرا بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ جیسے تاریکی نہ ہو تو روشنی بھی نہیں ہوسکتی۔ موت نہ ہو تو زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ـــــ نیز یہ ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب بھی ہوتے ہیں ـــ یعنی عنصرِ غالب آہستہ آہستہ مغلوب میں تبدیل ہوکر اسے غالب بنادیتا ہے۔

(ش) یہ طریقِ تصادم وتخلیق، ـــــ یا یوں کہیے کہ اشیاء میں استبدال و استخلاف کا عمل متواتر ـــــ شروع سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے، کبھی ختم نہیں ہوگا۔

(ص) یہ طریقِ عمل صرف اشیاء (THINGS) کے اندر کارفرما نہیں بلکہ انسانی فکر اور معاشرتی و معاشی نظامِ زندگی بھی اسی قانونِ اضداد کے تابع ہیں۔ ان میں بھی اسی طرح باہمی تصادم اور سلسلۂ تغیرات جاری و ساری رہتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے انسانی فکر کے متعلق تو یہ کہا ہے لیکن خود انسان کے متعلق اس نے بصراحت

کچھ نہیں کہا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک (بلکہ مادی تصورِ حیات کی رُو سے) کائنات میں مادہ کے علاوہ کسی اور شے کا وجود ہی نہیں، اس لئے انسان کا شمار بھی اشیاء (THINGS) میں ہوتا ہے اسلئے شاید اس کے متعلق کسی جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا یوں سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ دیگر اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے، وہی کچھ انسان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ (یہ نکتہ بڑا اہم ہے، اسے خاص طور پر ذہن میں رکھئے۔)

ایک اہم استثناء

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے اشیائے کائنات ہوں یا انسانی فکر و تصورات، ان میں سے کوئی بھی غیر متبدل نہیں۔ ہر ایک تغیر پذیر ہے۔ لیکن خود یہ قانون (LAW OF CONTRADICTION) جس کی رُو سے یہ تمام تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں، غیر متغیر اور غیر متبدل ہے۔ ماؤزے تنگ کے اپنے الفاظ میں۔

> یہ ایک عالمگیر صداقت ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماورا ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات کا عمومی، ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔

دوسرے مقام پر ماؤزے تنگ نے اسے معروضی قانون (OBJECTIVE LAW) کہا ہے۔ یعنی ایسا قانون جو نہ اشیائے کائنات کا پیدا کردہ ہے نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج ہے۔ چونکہ یہ قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے، اس لئے جب اسے موجود فی الخارج کہا جائے گا تو اس کا سرچشمہ لامحالہ کائنات (UNIVERSE) سے ماوراء قرار دیا جائے گا۔ اس نکتہ کا ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے۔

علم کسے کہتے ہیں

ماؤزے تنگ نے علم (KNOWLEDGE) کے متعلق کہا ہے کہ:

(۱) علم وہی علم ہے جسے حواس کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اسے (PERCEPTUAL - KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے۔

(۲) انسانی فکر چونکہ معاشرہ کے خارجی عناصر سے بھی متاثر ہوتی ہے، اس لئے کسی ایک زمانے میں انسان صداقت (TRUTH) کا صرف اضافی اور جزوی علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان کا جزوی علم بڑھتے بڑھتے ایک دن حقیقی اور کلی علم بن جاتا ہے۔ یعنی وہ صداقت مطلقہ (ABSOLUTE - TRUTH) تک پہنچ جاتا ہے۔

صداقتِ مطلقہ سے مراد قوانینِ فطرت ہیں۔

(۳) یہ دیکھنے کے لئے کہ انسان نے جو علم حاصل کیا ہے وہ صداقت ہے یا نہیں' اس علم کو عمل میں لانا ضروری ہے۔ اگر عملاً اس کا نتیجہ وہی ہو جو اس کا دعویٰ ہے تو وہ علم سچا ہے' ورنہ جھوٹا اور غلط۔ یعنی علم کی صداقت کی پرکھ (PRAGMETIC TEST) کی رُو سے ہو سکتی ہے۔

(۴) انسان کا جو عمل' قوانینِ فطرت کے مطابق ہوگا' وہی صحیح نتیجہ پیدا کر سکے گا۔

(۵) ظاہر ہے کہ اس طریق کی رُو سے' انسان کوئی صداقت (TRUTH) یا قانون (LAW) بناتا نہیں۔ جو صداقتیں یا قوانین کائنات میں موجود ہیں' انہیں صرف دریافت (DISCOVER) کرتا ہے۔

(۶) مختصر الفاظ میں' صداقت کے انکشاف کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نظریہ (THEORY) کو عمل میں لایا جائے۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہو اسے پھر نظریہ (یا CONCEPT) تصور کر کے اس پر عمل کیا جائے اس طرح ہر عمل کے بعد علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی۔ اس طریق کار کو مسلسل جاری رکھا جائے۔ اور اس طرح انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ جو عناصر اس انقلاب کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہوں گے' شروع شروع میں یہ جبراً انہیں راستے سے ہٹایا جائے گا لیکن رفتہ رفتہ ایسا مرحلہ آجائے گا جہاں دنیا کمیونزم کے نظام کو بطیبِ خاطر قبول کر لے گی۔ داخلی انقلاب کے بغیر خارج میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ خارجی عناصر اس پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں لیکن انقلاب کی اساس داخلی تبدیلی ہی ہوتی ہے۔

یہ ہے اس فلسفہ کی رُو سے علم کا تصور اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔

اِس فلسفہ کا جائزہ

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ فلسفۂ جدلیت کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے (THING) کے اندر دو متضاد عناصر ہر وقت مصروفِ جدل و پیکار رہتے ہیں اور اسی تصادم کے نتیجہ میں وہ شے' کچھ عرصہ کے بعد بالکل نئی شے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک "شے" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں غیر جاندار اشیاء' جاندار مخلوق' خود انسان' انسانی فکر اور انسانی تمدنی اور معاشی نظام سب شامل ہیں۔ جہاں تک غیر جاندار اشیاء یا (انسان کے علاوہ دیگر) جاندار مخلوق کا تعلق ہے' ان میں عملِ نشو ونما کا

سوال ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس پر بحث نہیں کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی نشوونما کے اصول وطریق کے سوال کا تعلق طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) سے ہے۔ اسے فلسفہ کے دائرے میں آنا ہی نہیں چاہیئے (اگرچہ آجکل یہ رجحان بھی فروغ پا رہا ہے کہ طبیعی سائنس کی بنیاد بھی فلسفہ ہی پر رکھ دی جائے) بہرحال، یہ سوال ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، اس لئے ہم اس پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا تعلق خود انسان سے ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے اس سوال کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انسان کے طریق نشوونما کے متعلق ماؤزے تنگ نے بصراحت الگ بحث نہیں کی۔ اس کے نزدیک جس اصول یا طریق عمل کا اطلاق اشیائے کائنات پر ہوتا ہے اسی کے مطابق انسان کی نشوونما بھی عمل میں آتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ وہی قانون اضداد خود انسان پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اس فلسفہ کی رُو سے کہا یہ گیا ہے کہ

(۱) متضاد عناصر کے باہمی تصادم کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

(۲) اس تصادم کے سلسلہ میں، ہر نئی شے جو وجود میں آتی ہے، پہلی شے سے بہتر اور ارفع ہوتی ہے۔

(۳) اس قانونِ ارتقاء میں رجعت (واپس لوٹنا) نہیں۔ آگے بڑھنا ہی ہے۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جامد مادہ، اس طریق جدلیت کی رُو سے، رفتہ رفتہ، پیکرِ انسانی میں تبدیل ہو گیا۔ اس میں نئی چیز اس کی فکر اور شعور ـــــ بلکہ شعورِ خویش (SELF-CONSCIOUS-NESS) ہے۔ اس لحاظ سے، یہ سابقہ کڑیوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جدلیت کے لامتناہی سلسلہ کی رُو سے، اس کے بعد کیا ہوگا؟ ـــــ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ موت کے بعد، انسانی جسم بے جان مادہ رہ جاتا ہے۔ جو کچھ عرصہ کے بعد منتشر (DE-COMPOSE) ہو کر مختلف کیمیائی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے ـــــ لوہا، چونا، فاسفورس وغیرہ۔ اگر انسان اسی جسم کا نام تھا تو اس کی یہ تبدیلی، اسے آگے لے جانے کے بجائے، جامد مادہ کی اسی پہلی کڑی میں لے گئی جہاں سے سلسلۂ ارتقا کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ ارتقاء نہیں، رجعت ہے اور رجعت بھی ایسی کہ جدلیت کی کشمکش نے جو منازل ہزارہا سال میں طے کئے تھے، موت کی اک ضربِ کاری نے ان سب کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور بات جہاں سے چلی تھی پھر وہیں پہنچ گئی۔ قرآن کی مثال میں، بڑھیا نے جو سوت دن بھر کی محنت سے کاتا تھا، شام کو اسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کر کے رکھ دیا اور دوسرے دن وہ پھر چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ موت سے ایک فرد کا تو خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن نوعِ انسانی (HUMAN SPECIES) باقی رہتی ہے ۔۔۔ مرنے والا، اپنے جیسا انسان پیدا کر دیتا ہے ۔۔۔ تو اس سے بھی اس فلسفہ کی تغلیط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے وہ شے (یعنی انسان) کسی دوسری شے میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ویسے کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ ترقی (PROGRESS) نہیں۔ اعادہ (REPITION) ہے۔ یہ خطِ مستقیم پر آگے بڑھنا نہیں، ایک دائرے کے چکر میں گھومنا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک فرد بجائے خویش ایک شے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فرد میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ ۔۔۔ فلسفۂ اضداد کی رُو سے، اسے اپنی موجودہ ہیئت سے مختلف اور ارفع صورت میں تبدیل ہونا چاہیئے۔ نسلِ انسانی کی بقا سے وہ فرد تو باقی نہیں رہتا، نہ ہی کسی اعلیٰ پیکر میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا جسم مادی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا بہ حیثیتِ فردِ انسانیہ خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جو ایک فرد میں باہم گر مصروفِ پیکار رہتے ہیں؟ ۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ جسمِ انسانی کے اندر ہر آن تعمیر و تخریب (ANABOLISM & KATABOLISM) کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے پرانے جرثومے (CELLS) ہر وقت فنا، اور ان کی جگہ نئے جرثومے وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے اس کا جسم ہر آن ایک بنتے جسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے کے بعد، وہ ایک بالکل نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلۂ تصادم تو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں چلتا ۔۔۔ اور فلسفۂ جدلیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سلسلۂ تصادم لامتناہی ہے۔ لہٰذا انسان اگر عبارت ہے اس کے طبیعی جسم سے تو اس سے اس فلسفہ کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔

اگر انسان کے اندر یہ تصادم اس کے جرثوموں کا نہیں، تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جن میں ہر آن کشمکش جاری رہتی ہے۔ ان میں سے ایک عنصر اس کا جسم ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ دوسرے عنصر کو جسم کی ضد (OPPOSITE) ہونا چاہیئے۔ وہ کیا ہے؟ پھر ان دونوں میں سے، اس وقت کون سا عنصر غالب یا بنیادی (PRINCIPAL) ہے اور کون سا مغلوب یا ثانوی (SECONDARY)۔ اور جب، کچھ عرصہ کے بعد، ان عناصر میں باہمی تبادلہ ہو جائے گا یا ایک عنصر ختم ہو جائے گا تو انسان کیا بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ اس وقت بنے گا اس کی نوبت موت کے بعد ہی آئے گی۔ اس سے واضح ہے کہ (فلسفۂ جدلیت کی رُو سے بھی) موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب فلسفۂ جدلیت یا ماؤزے تنگ کی فکر سے نہیں ملتا۔

دوسرا اہم نکتہ فلسفۂ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات میں ایک ایسی شے بھی ہے جو ——

(۱) خود اشیاء کے اندر موجود نہیں۔
(۲) عمل تضاد و تصادم کی پیدا کردہ نہیں۔
(۳) ازلی و ابدی اور غیر متبدل ہے۔
(۴) ذہن انسانی کی پیدا کردہ نہیں۔
(۵) موجود فی الخارج ہے۔
(۶) عالمگیر حقیقت اور صداقت مطلقہ ہے۔
(۷) ذہن انسانی صرف اس کا انکشاف کر سکتا ہے، اس کی تخلیق نہیں کر سکتا۔

اور یہ شے ہے خود قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION)۔

مادی فلسفۂ حیات کی رُو سے اس قسم کی شے کا وجود ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن جب اس کے وجود کا امکان تسلیم کر لیا گیا ہے، تو پھر اگر کوئی یہ کہے کہ اس قسم کا صرف ایک قانون (قانونِ اضداد) ہی نہیں، اور بھی کئی قوانین ایسے ہیں، تو اس فلسفہ کے حامیوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسے قوانین کے امکان سے انکار کریں۔ یا اس تصور کے خلاف اعتراض کریں۔ اگر کوئی شخص، خود اس معیار کے مطابق جو فلسفہ جدلیت کے حامی، کسی دعوے کی صداقت کو پرکھنے کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ یعنی (PRAGMATIC - TEST) کی رُو سے، کسی اور قانون کو بھی صحیح ثابت کر دے، تو ان حضرات پر لازم آئے گا کہ اس قانون کو بھی مطلق حقیقت (ABSOLUTE TRUTH) تسلیم کریں۔ یہ ان کے اپنے دعوے کا منطقی نتیجہ ہے۔

تیسرا نکتہ ماؤزے تنگ نے اپنے "اقوال" میں ایک جگہ کہا ہے کہ

کمیونزم، تاریخ انسانیت میں، مکمل ترین، ترقی پذیر، انقلابی اور معقول نظام ہے۔

یہ تصور، فلسفۂ اضداد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، کوئی شے، کوئی تصور، کوئی نظام، کسی وقت بھی مکمل نہیں ہوتا۔ وہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور ہر آن بدلتا رہتا ہے اور تغیرات کا یہ عمل لامتناہی ہوتا ہے۔

چوتھا نکتہ ماؤزے تنگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

ملوکیت یا استعماریت کا نظام اب، زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ شرانگیز کام (EVIL THINGS) کرتا ہے۔

یہ خیال بھی فلسفۂ اضداد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، کسی نظام کے باقی رہنے یا مٹنے کا یہ اصول نہیں، کہ جو نظام، تعمیری کام کرے گا وہ باقی رہے گا اور جو تخریبی کام کرے گا مٹ جائے گا۔ اس فلسفہ کی رو سے، اضداد کا قانون از خود کارفرما ہے۔ اس کے مطابق، ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ضد، دوسرا نظام موجود ہوتا ہے۔ ان دونوں میں باہمی تصادم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مغلوب نظام، غالب آجاتا ہے۔ اس کے بعد، پھر یہ چکر جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ہی کوئی نظام اس لئے وجود میں آتا ہے کہ اس نے اچھے کام کئے تھے، نہ ہی وہ اس لئے مٹتا ہے کہ اس سے خراب کام سرزد ہوتے تھے ــــ وہ نظام کیسا ہو اور خواہ کسی قسم کے کام کرے، اسے اپنی باری پر، بہرحال، مٹنا ہے ــــ تاریخی وجوب یا قانونِ اضداد کی اندھی قوتیں، نہ اچھے کو دیکھتی ہیں نہ بُرے کو ــــ انہوں نے تو ایک کو مٹانا ہے اور اس کی جگہ اس کی ضد دوسرے کو لانا ہے۔ انسان ہزار چاہے اور اس کے لئے لاکھ کوشش کرے کہ اچھا نظام مٹے نہیں، قائم رہے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تغیرات لانے والی یہ قوتیں انسان کے نفع یا نقصان کی پرواہ ہی نہیں کرتیں ــ انسان، ان کی گردش دولابی کی مشین میں ایک بے بس پرزے کی طرح ہے کہ جس قسم کا نظام وہ لائے، یہ اس کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں ماؤزے تنگ کا پیش کردہ قانونِ اضداد ــــ اس قانون کا جو تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے مقصود نکتہ چینی نہیں ــ یہ قرآنی فلسفۂ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کے لئے ناگزیر تھا۔

باب دوم

قرآنی فلسفۂ حیات

کائنات کے متعلق جو فلسفہ (یا تصور) قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ ایک حد تک فلسفۂ جدلیت کے

دوشش بدوش چلتا ہے۔ لیکن جو اسقام فلسفہ جدلیت میں ہیں، قرآنی تصوران سے مبرا ہے۔ اور جس مقام پر وہ فلسفہ رک جاتا ہے، قرآنی تصور انسان کو اس سے آگے لے جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں قرآنی تصور کو مختصر الفاظ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث حسب ذیل گوشوں میں منقسم ہوگی۔

۱۔ قرآن کا اندازِ افہام و تفہیم
۲۔ تخلیق کائنات
۳۔ انسان کی تخلیق
۴۔ انسانی زندگی کی کشمکش
۵۔ قانونِ اضداد
۶۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے
۷۔ مستقل اقدار
۸۔ کشمکشِ حق و باطل
۹۔ اضداد میں توافق
۱۰۔ علم کا تصور

۱۔ قرآن کا طریق افہام و تفہیم

قرآنِ کریم کا ایک اندازِ افہام و تفہیم یہ ہے کہ وہ ایک شے یا نظریہ کی ضد کو اس کے سامنے لاکر اس کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً ــ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ــ اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔ ــ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ــ نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہوسکتی ہے ــ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۔ نہ ہی دھوپ اور سایہ یکساں ہوسکتے ہیں ــ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ــ (۳۵/۱۹-۲۲) نہ ہی مردے اور زندہ برابر ہوسکتے ہیں۔ اسی نظریات اور تصورات کے سلسلہ میں وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر، ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت، حق کے مقابلہ میں باطل، کلمہ طیبہ کے مقابلہ میں کلمہ خبیثہ لاکر اپنے مطالب و معانی کی وضاحت کرتا ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ــ ماقذ سے تنگ اسی قسم کی مثالیں پیش کرنے کے بعد، کہتا ہے کہ ان متضاد اشیاء میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں ہوتا) لیکن قرآن کریم ان اضداد کو معانی و مطالب کی وضاحت کے لئے پیش کرتا

ہے۔ وہ یہ تصور پیش نہیں کرتا کہ یہ متضاد اشیاء از خود ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی ہیں۔ یہ تصور درحقیقت جو سیت (MARXISM) نے پیش کیا تھا۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ (۳۹/۲۳) کہا ہے۔ یعنی کتاب جس کی تعلیم شروع سے اخیر تک، مربوط اور آپس میں ملتی جلتی ہے۔ اس میں کہیں تخالف نہیں تضاد نہیں۔ لیکن یہ اپنے مفہوم کی وضاحت، متضاد اشیاء کو ایک دوسرے کے بالمقابل لاکر کرتی ہے (تصادم اور ٹکراؤ کے متعلق ہم آگے چل کر بات کریں گے)

قرآن کریم اشیاء فطرت کے اختلاف کو مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ (نشانات خداوندی) میں شمار کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ ۔۔۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ .... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔ (۲/۱۶۴) یعنی تخلیق ارض و سما اور اختلاف لیل و نہار میں ان لوگوں کے لئے نشانات راہ ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ - وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ۔ (۳۰/۲۲)

ارض و سما کی تخلیق اور انسانوں کے رنگ اور زبان کا اختلاف بھی آیات خداوندی میں سے ہے۔

لیکن وہ نسلوں اور زبانوں کے اس اختلاف کے باوجود، تمام نوعِ انسانی کو، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر، ایک برادری (اُمّتِ واحدہ) بنانا چاہتا ہے۔ یہ ہے اس کے نزدیک توافقِ اضداد (UNITY OF OPPOSITES) کا طریق۔

۲۔ تخلیقِ کائنات

عملِ تخلیق کے متعلق قرآنِ کریم کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ کائنات کو بیک جنبش، مکمل شکل میں پیدا نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ یہ بتدریج، عملِ ارتقاء کی رو سے تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔ واضح رہے کہ عربی زبان اور خود قرآن کریم کی رو سے، ایک عمل ہے فطر کا اور دوسرا ہے خلق کا۔ فطر کے معنی ہیں کسی شے کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا۔ اور خلق کے معنی ہیں، مختلف عناصر میں توازن ترتیب سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ (یہ لفظ عام طور پر انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اسے

فطر کے مفہوم میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے) خدا کے عملِ فطرت کے متعلق تو قرآن کریم کوئی تشریح پیش نہیں کرتا کیونکہ عدم سے وجود میں آنے کا سوال، انسان کے شعور کی موجودہ سطح پر اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن عملِ تخلیق کے متعلق وہ صراحت سے بات کرتا ہے[1]۔ وہ کہتا ہے کہ — يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ — ایک شے کی تخلیق کی اسکیم، عالمِ امر کی بلندیوں میں طے پاتی ہے۔ پھر اس اسکیم کا عملی آغاز زمین کی پست ترین سطح سے ہوتا ہے — ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ۔ (۳۲/۵)۔ اس نقطۂ آغاز سے وہ، بتدریج بلندیوں کی طرف ابھرتی ہے تاکہ اس اسکیم کے مطابق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ تدریجی مراحل وہ، ایک ایک دن میں طے کرتی ہے جس کی مقدار، تمہارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں پچاس پچاس ہزار سال کی (۷۰/۴)

ان تخلیقی مدارج کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ — وَالَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ۔ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ۔ (۸۷/۲-۳) — خدا وہ ہے جو اشیائے کائنات کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ ان میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے، انہیں ایک خاص اعتدال پر لاتا ہے۔ پھر ان کا ایک مقامِ تکمیل (DESTINY) مقرر کرتا ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہیں راستہ دکھا دیتا ہے۔ اسی عملِ ارتقا کو اس نے دو لفظوں میں یوں بیان کیا ہے۔

إِنَّهُ يُبْدِئُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ (۸۵/۱۳)

خدا وہ ہے جو ہر شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اسے گردشیں دیتا ہوا مختلف مراحل میں سے گزارتا ہے۔

مثلاً اس نے زمین اور اجرامِ فلکی کے تخلیقی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ

۱۔ یہ تمام اجرام، ابتداءً ایک ہیولیٰ (NEBULAE) کی شکل میں ایک ہی تھے۔ پھر الگ الگ ہوئے۔ (۲۱/۳۰)

۲۔ یہ ہیولے گیس کی شکل میں تھا۔ (۴۱/۱۱)

---

[1] اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ وہ طبیعی امور کے متعلق تفصیلی گفتگو کرے۔ اسکا موضوع انسانی زندگی کے مسائل کو سلجھانے کے لئے راہ نمائی عطا کرنا ہے۔ وہ طبیعی امور کے متعلق بعض ضمناً بات کرتا ہے لیکن چونکہ وہ اس خدا کی طرف سے ہے جو خالقِ کائنات ہے اسلئے ہو نہیں سکتا کہ وہ ضمناً بھی کسی بات کے متعلق کچھ کہے تو وہ حقیقت کے خلاف ہو۔

۳۔ زمین اس ہیولے سے یوں الگ ہوتی جیسے گوپیئے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ (۷۹/۲۹)
۴۔ ان اجرام کو چھ مختلف مراحل میں سے گذارا ۔ (۱۰/۳۲)
۵۔ زمین بھی، اس ہیولے سے الگ ہونے کے بعد، دو مراحل میں سے گزر کر اس قابل ہوئی کہ اس پر زندگی کی نمود ہو سکے۔ (۴۱/۹)
۶۔ زندگی کی نمود پانی سے ہوئی ۔ (۲۱/۳۱) ۔۔۔ اور اس طرح بتدریج، جانداروں کی تخلیق ہوئی ۔۔۔ یعنے رینگنے والے، دو پاؤں پر چلنے والے، چار پاؤں پر چلنے والے ۔ (۲۴/۲۵)

اس تمام عمل (PROCESS) میں خدا کی صفتِ ربوبیت کارفرما ہوتی ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں ایک شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج مقامِ تکمیل تک پہنچنے کے لئے سامانِ نشوونما عطا کرنا۔ ان مراحل میں سے گزرتی ہوئی ایک شے، کچھ وقت کے لئے ایک مقام میں ٹھہرتی ہے۔ اس کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف چل دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے ان اشیاء کا "مستقر و مستودع" کہہ کر پکارا ہے (۶/۱۱) یعنے کسی شے کی عارضی قرارگاہ اور اس کے بعد وہ اگلی منزل "جس کے سپرد اس امانت کو کر دیا جاتا ہے" ۔۔۔ اس نئی منزل میں پہنچ کر وہ شے، کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ اسے وہ، اس شے کی نَشْأَةُ الْآخِرَة سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس کی دوسری پیدائش۔ سورۃ عنکبوت میں ہے

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ـ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۔ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ (۲۹/۲۰)

ان سے کہو کہ دنیا میں چلو پھرو۔ اور دیکھو کہ خدا کس طرح ایک شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ اور پھر اسے کس طرح ایک نئی (دوسری) پیدائش عطا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ان پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اشیاء کائنات کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

یہ تغیر کائنات کی ہر شے میں ہر آن رونما ہوتا رہتا ہے ۔۔۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ (۵۵/۲۶) کائنات کی ہر شے، ہر آن تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر نئے مرحلہ میں اس کی نشوونما کے تقاضے مختلف ہوتے ہوتے ہیں اور خدا کی صفتِ ربوبیت اس کے تقاضوں کے مطابق سامانِ نشوونما عطا کئے جاتی ہے۔ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۔ (۵۵/۲۹) کائنات کی ہر شے ہر آن، ایک نئی ہیئت میں ہوتی ہے اور اپنی نشوونما کے لئے خدا کی شانِ ربوبیت کی محتاج۔ یوں

وہ شے نشو و نما پاکر ایک نئی شے بن جاتی ہے۔ اس طرح کائنات میں نت نئے تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۔ (۳۵/۱)

وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق مخلوق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

غالبؔ کے الفاظ میں ۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز !
رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

ان تخلیقی تبدیلیوں کے سلسلہ میں وہ یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اس طرح یہ تمام کارگہِ کائنات رفتہ رفتہ، ایک اور قالب میں ڈھل جائے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ۔ (۱۴/۴۸)

جس مرحلہ میں یہ ارض کسی اور ارض میں تبدیل ہو جائے گی اور اسی طرح سماوات بھی[1]

اس لئے کہ ـــ هُوَ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۔ (۱۷/۹۹)۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کائنات کی مثل دوسری کائنات بنا دے؛

لیکن جس طرح یہ سلسلہ کائنات ازلی نہیں یعنے ایسا نہیں کہ اس کی ابتدا کوئی نہ ہو، اسی طرح یہ ابدی بھی نہیں کہ اس کی انتہا کوئی نہ ہو ـــ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ (۳۵/۱۳)۔ یہ سلسلہ ایک نشان کردہ مدت تک کے لئے رواں دواں چل رہا ہے۔

ان اشیاء میں سے جو اشیاء (خارجی اثرات کے تابع) آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دیتی ہیں۔ اُس کی ترقی رُک جاتی ہے پھر وہ یا تو معدوم ہو جاتی ہے اور یا اُسی مقام پر گردش کرتی رہتی ہے۔ جس طرح آم کی گٹھلی سے اُسی قسم کا آم کا درخت پیدا ہو جاتا ہے، بکری اپنے جیسا بچہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ گردشِ دولابی (REPITITION) ۔ یا تولید (REPRODUCTION) ہے۔ ارتقاء آگے بڑھنا ہے۔

---

[1] اس تبدیلی سے مراد وہ عالمگیر انقلاب عظیم بھی ہو سکتا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ عالمِ انسانیت میں رونما ہوگا اور کائنات کی طبعی تبدیلی بھی۔

۳۔ اِنسان کی تخلیق

انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ایک خاص منزل تک یہ بھی انہی تخلیقی مراحل میں سے گزرتا ہے جن سے دیگر اشیائے کائنات اور جاندار مخلوق گزرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں ۔ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانَ مِنْ طِیْنٍ ۔ (۳۲/۷) ۔ انسانی تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ (INORGANIC - MATTER) سے ہوئی۔ جامد مادہ میں، زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ لیکن جب اس میں پانی کی آمیزش ہوتی ہے، تو حیاتِ خوابیدہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھتی ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰)۔ ہر شے کو زندگی پانی سے عطا ہوتی ہے۔ مٹی اور پانی کے امتزاج سے (جسے قرآن نے طینِ لازب کہا ہے یعنی چپچپی مٹی) زندگی کا اولین جرثومہ (LIFE - CELL) وجود میں آیا جس میں نر و مادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ یعنے زندگی کا آغاز (UNI - CELLULAR) طریق سے ہوا۔ اسے قرآن نے "نفسِ واحدہ" سے تعبیر کیا ہے۔ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَۃٍ ۔ (۳۹/۶) ۔ "خدا نے تمہیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا"۔ یہ جرثومۂ حیات، جوشِ نمو سے پھٹ کر دو ٹکڑوں (SISTER CELLS) میں تقسیم ہو گیا اور یوں نر و مادہ کی تفریق و تمیز وجود میں آگئی ۔۔۔ وَخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا ۔ (۳۹/۶) ۔۔۔ اور اس طرح اس جرثومۂ واحدہ سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

قرآنِ کریم نے "جوڑے" کے لئے لفظ "زوج" استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ایسے جوڑے کے ہیں جس کے ایک جزو کے بغیر دوسرے جزو کی تکمیل نہ ہو سکے۔ یعنی وہ دونوں اجزا ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب (COMPLEMENTARY TO - EACH OTHER) ہوتے ہیں۔ یہ جوڑے صرف جانداروں میں نہیں، ہر شئے میں ہوتے ہیں۔ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا ۔ (۴۳/۱۲) ۔ اُس نے ہر شے کے جوڑے پیدا کئے جو ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہیں۔

مختلف اشیائے کائنات میں، ازواج کا اختلاط کس طرح ہوتا ہے؟ یہ سوال ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے۔ جہاں تک انسانی تخلیق کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ (دیگر حیوانات کی طرح) نر اور مادہ (عورت اور مرد) کے جنسی اختلاط سے، رحمِ مادر میں انسانی بچے کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بچہ (جنین) ۔۔۔ دیگر حیوانات ہی کی طرح ۔۔۔ رحم میں مختلف منازل سے گزرتا ہے ۔ قرآن کے الفاظ میں ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰہُ نُطْفَۃً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ۔ استقرارِ حمل کے بعد۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَۃَ

عَلَقَةً ۔ یہ جرثومہ آہستہ آہستہ جونک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ فَجَعَلْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ پھر وہ گوشت کا لوتھڑا سا بن جاتا ہے ۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا ۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ سا ابھر آتا ہے ۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ سی چڑھ جاتی ہے۔ (۲۳/۱۲-۱۴)

یہاں تک انسان اور دیگر حیوانات کے بچے یکساں مراحل سے گزرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد، ایک مقامِ امتیاز آجاتا ہے جو درحقیقت مادی تصورِ حیات اور قرآنی نظریۂ زندگی کا نقطۂ تفریق ہے۔ اس سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس مقام پر پہنچکر قرآن نے کہا ہے کہ

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۔ (۲۳/۱۴)

پھر ہم اسے ایک نئی مخلوق بنا دیتے ہیں ؛

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تبدیلی ہے جس سے انسان، دیگر حیوانات سے مختص اور متمیز ہو کر، ایک "نئی مخلوق" بن جاتا ہے؟ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)

اس میں خدا اپنی روح (توانائی) کا ایک شمہ ڈال دیتا ہے۔

یہ الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے جس کے اضافہ سے انسان، دیگر مخلوقات سے بالکل الگ اور ممتاز مخلوق بن جاتا ہے۔ یہ "نفخ روحِ خداوندی" انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کے حصے میں نہیں آیا۔ اسی کو انسانی ذات (HUMAN - PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی ہے جسے "میں" کہا جاتا ہے۔ یہ اَنا (I - AM - NESS) ہے جو اس حیوان کو انسان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی کے احساس کو شعورِ خویش (SELF - CONSCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ اسی سے انسان اپنے ہر ارادہ، فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے یہ اس قابل ہوتا ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔ اس تبدیلی کو قرآن کریم نے بڑے بلیغ، لطیف اور حسین انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے، اسے صیغۂ واحد غائب (THIRD - PERSON) سے پکارتا چلا جاتا ہے۔ (خَلْقَهٗ ، نَسْلَهٗ ، سَوّٰىهُ)۔ لیکن اس کے بعد جب اس میں "نفخِ روح" ہو جاتا ہے تو اس صیغۂ غائب کو یک لخت صیغۂ مخاطب (SECOND PERSON) میں تبدیل کر کے کہتا ہے۔

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۔ (۳۲/۹)

پھر خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔

یعنی اس طرح وہ مخلوق (انسان) اس قابل ہو جاتی ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں مادی تصورِ حیات اور قرآنی نظریۂ تخلیقِ انسانی میں وہ فرق نمودار ہوتا ہے جس کے بعد ان کے راستے بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ مادی تصورِ حیات کی رُو سے، انسان محض اس کے طبیعی جسم سے عبارت ہے۔ طبیعی قوانین کے مطابق دیگر حیوانات کی طرح اس کی پیدائش ہوتی ہے طبیعی قوانین کے ماتحت اس کی نشوونما ہوتی ہے اور جب طبیعی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رُک جاتی ہے تو اُسے موت آجاتی ہے اور یوں اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ "نفخِ روحِ خداوندی" کے بعد جب انسان، ایک خلقِ جدید (نئی مخلوق) میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں ایک ایسی شے کی نمود ہو جاتی ہے جو نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہے، نہ طبیعی قوانین کے مطابق اس کی نشوونما ہوتی ہے اور نہ ہی جسم کی موت کے ساتھ اُس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ وہ، انسان کی موت کے بعد، زندہ رہتی اور زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا۔ (۷۱/۱۴)

خدا نے تمہیں مختلف مدارج میں سے گزارتے ہوئے پیدا کیا۔

ان مدارج و مراحل میں، ہر نیا درجہ اور مرحلہ، سابقہ درجہ اور مرحلہ سے بلند تھا۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو سکتا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ (۸۴/۱۹)

تم اسی طرح طبقًا طبقًا، درجہ بدرجہ، بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔

موت سے تمہارے جسم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تمہارا نہیں۔ تم ایک نئی زندگی (فِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۳۴/۷) میں داخل ہو جاتے ہو۔ موت تو اس بات کا ٹسٹ (TEST) کرنے کے لئے ہے کہ تم میں آگے بڑھنے کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (۶۷/۲)

موت اور حیات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کا ٹسٹ ہو جائے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے اندر کس قدر حسن و توازن پیدا کر لیا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ جب جسمِ انسانی کے اجزاء منتشر ہو کر پھر سے لوہا اور پتھر بن گئے تو انہیں حیاتِ نو

کس طرح مل سکتی ہے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ ان اجزا سے تمہارا جسم مرکب تھا۔ "تم" ان کے مجموعہ یا امتزاج کا نام نہیں تھے۔ اس لئے جسم کے بکھر سے بے جان مادہ بن جانے سے "تم" فنا نہیں ہو جاتے۔

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ۔ (۱۷/۵۱)

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا، یا کوئی اور شے، جس کے متعلق تمہارے ذہن میں ہو کہ اس کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تم ایک ایسی "نئی مخلوق" بن چکے ہو جو طبیعی قوانین کی زد میں نہیں آتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مادی جدلیت کا پیش کردہ نظریہ یہ ہے کہ بے جان مادہ، عملِ ارتقاء سے بڑھتا بڑھتا پیکرِ آدمیت تک آگیا۔ اب اس کے بعد، ارتقا کی بجائے رجعت ہوگی۔ انسان، مرنے کے بعد، پھر انہی اجزا میں تبدیل ہو جائے گا، جن کے ارتقاء سے وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ارتقا میں رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔ زندگی کی ندی کا جو پانی آگے بڑھ گیا وہ لوٹ کر پیچھے نہیں آسکتا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ اس زندگی میں جن لوگوں کی انسانی صلاحیتوں کی صحیح نشو ونما نہیں ہوئی ہوگی وہ مرنے کے وقت کہیں گے کہ رَبِّ ارْجِعُونِي لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ۔ اے میرے نشو ونما دینے والے! زندگی کے دھارے کا رُخ ایک بار پیچھے کی طرف موڑ دے، کہ جو مواقع میں نے پہلے کھو دیئے تھے وہ پھر حاصل ہو جائیں، تو میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشو ونما ہو جاتے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا — كَلَّا (۲۳/۹۹-۱۰۰)، نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹا کرتا۔ عملِ ارتقا میں رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں یا آگے بڑھنا ہے یا ایک مقام پر رُک جانا — پیچھے مُڑنا نہیں — (آگے بڑھنے کا نام، قرآن کی اصطلاح میں جنت کی زندگی ہے۔ رُک جانے کا نام جہنم۔ اور یہ سلسلۂ ارتقاء جنت کی زندگی میں بھی بدستور جاری رہتا ہے۔ ان نکات کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ اس لئے اس وقت انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔)

آپ نے غور کیا کہ جس مقام پر آکر فلسفہ اضداد رُک ہی نہیں جاتا بلکہ اس کی تمام عمارت نیچے گر جاتی ہے۔ قرآن کریم اس مقام سے انسان کو کس طرح آگے لے جاتا ہے۔

۴۔ انسانی زندگی کی کشمکش

جس طرح انسانی بچہ کو اس کا جسم اور جسمانی صلاحیتیں، نشوونما یافتہ (DEVELOPED) شکل

میں نہیں ملتے۔ ان کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اسی طرح اسے انسانی ذات بھی نشو ونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی۔ اس کی بھی نشو ونما ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہو یا اس کی ذات کی نشو ونما، یہ اضداد کے تصادم (CONTRADICTIONS) کی رُو سے ہوتی ہے۔ جسمِ انسانی میں یہ تصادم، زندگی کے جرثوموں کے ہر آن فنا ہونے اور نئے جرثوموں کے وجود پذیر ہوتے رہنے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ زندگی، صحت، بیماری، موت، اسی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسانی ذات کی نشو ونما کن متضاد عناصر کے تصادم سے ہوتی ہے۔ یہ سوال غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی پرورش کیلئے کچھ قوانین ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشو ونما کے لئے بھی کچھ قوانین وضوابط ہیں۔ انسانی جسم کی پرورش سے متعلق قوانین کو قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ اور انسانی ذات کی نشو ونما سے متعلق قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار بھی، قوانینِ فطرت کی طرح، غیر متبدل، اور عالمگیر ہیں۔ ان اقدار کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت صرف ایک بنیادی قدر کو مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔

جسمِ انسانی کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود استعمال کرتا ہے۔ (مثلاً کھانا، پینا، وغیرہ) اس کے لئے ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹتا چلا جائے۔ عقلِ انسانی، اس کے اس جذبہ کی تسکین کے لئے، اسے مختلف راہیں سجھاتی اور متنوع حربے سکھاتی ہے۔ نیز اس کی اس روش کیلئے جواز کی دلیلیں (JUSTIFICATORY REASONS) تراشتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشو ونما کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنے جسم کی ضروریات سے زاید جو کچھ ہو اُسے دوسروں کی نشو ونما کے لئے دیدے۔ اس طرح انسانی جسم کے تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کشمکش اور تصادم کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں، "ابلیس وآدم کی آویزش" سے تعبیر کیا ہے۔ ابلیس (یا شیطان) انسان کے ان جذبات کا ترجمان ہے جو اس کے طبعی تقاضوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں، ابلیس وآدم کی نمود ایک ہی وقت میں ہوتی ہے۔ اور ابلیس کو آخر تک، آدم کے مدمقابل رہنے کی مہلت بھی دے دی گئی ہے۔ (قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۔ ۷/۱۵)۔ خدا نے ابلیس سے کہا کہ ہاں! تمہیں مہلت دیجاتی ہے) لہٰذا، انسان کے اندر، اضداد کی یہ کشمکش، شروع سے ہے اور آخر تک رہے گی ـــــ ایک فرد کی زندگی میں بھی اور نوعِ انسان کی حیاتِ اجتماعیہ میں بھی ـــــ

(حیاتِ اجتماعیہ میں ان دو گروہوں کی شکل میں، جن میں سے ایک اپنے ذاتی مفاد کے حصول کو مقصد زندگی قرار دے اور دوسرا گروہ ان کا جو نوعِ انسانی کے مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھیں)۔ اس ٹکراؤ سے انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نمود اور نشو و نما ہوتی ہے۔ اس سے اس کی قوت بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کی قوت بڑھتی جاتی ہے، ابلیسی تقاضے اس سے مغلوب ہوتے جاتے ہیں۔ اسی لئے ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ تو جس قدر چاہے زور لگا لے ۔۔ اِنَّ عِبَادِی لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ ۔ (۱۵/۴۲)۔ جو لوگ میرے قوانین کا اتباع کریں گے، ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔

واضح رہے کہ قرآنی تصور کی رو سے "ابلیس کا کبھی خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ انسانی ذات کی نشو و نما یافتہ قوتوں کے سامنے جھک جاتا ہے، ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سلسلۂ ارتقاء میں آگے بڑھنے اور رُک جانے کے لئے اصول یہ بتایا ہے کہ

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ وَمَنْ خَفَّتْ
مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ۔ (۷/۹-۸)

جس کا تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب و کامران ہوگا۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا، وہ نقصان اٹھائے گا۔

یعنی یہ نہیں کہ آگے وہ بڑھ سکے گا جس کا تخریبی پلڑا بالکل خالی ہوگا۔ آگے وہ بڑھے گا جس کی ذات کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ جو تخریبی قوت پر غالب آ چکا ہوگا۔ یہاں زندگی اور ارتقاء کا معیار، ثقلِ موازینہ (پلڑے کا بھاری ہونا) ہے۔

"نفس کشی" ۔۔ یعنی ابلیسی قوتوں کو فنا کر دینے ۔۔ کا تصور، خانقاہیت کا پیدا کردہ فریب ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت وہی ہے جس کی تائید قرآن کر رہا ہے۔ اگر تصادم کا امکان باقی نہ رہے، تو زندگی کی جوئے رواں، جوہڑ بن کر رہ جائے۔ اس میں حرکت و حرارت، اسی تصادم کی بدولت ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ۔۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

یہ ہے وہ دو گونہ عملِ اضداد، جو انسان کے اندر کارفرما رہتا ہے۔ ایک تضاد اس کے جسم کے اندر، اور دوسرا تضاد اس کے طبیعی تقاضوں اور ذات کے تقاضوں کے اندر ۔۔ واضح ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں کہ انسانی جسم کے طبیعی تقاضوں کو فنا کر دیا جائے۔ قطعاً نہیں۔ وہ جسم کی پرورش کو بھی ضروری قرار دیتا

ہے، وہ کہتا صرف یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے میں ٹکراؤ ہو تو ذات کے تقاضا کو ترجیح دینی چاہیئے، کیونکہ یہ حیات کی ارفع اور آگے چلنے والی شکل کا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس مقام پر بھی، قرآنی فلسفۂ حیات، کس طرح مادی جدلیت کے فلسفہ سے آگے لے جاتا ہے۔

۵۔ قانونِ اضداد

قانونِ اضداد (تصادم) خود خالقِ کائنات کا پیدا کردہ، اور اس کی اسکیم کا لاینفک حصہ ہے۔ وہ چاہتا تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کے تصادم کا امکان نہ ہوتا۔ سب انسان مجبوراً ایک ہی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ اس لئے انسان کو ایسا نہیں پیدا کیا۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (۱۰/۹۹) اگر خدا چاہتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ سب کے سب مومن ہوتے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام ایسا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے فیصلہ سے جو راستہ چاہے اختیار کرلے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ (۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔

اختیار و ارادہ، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسی سے یہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کی خارجی دنیا کی ہئیت بدل جاتی ہے۔ یہی صورت افراد کی ہوتی ہے اور یہی کیفیت اقوام کی۔ اس کا واضح فیصلہ ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۔ (۱۳/۱۱)

یاد رکھو! خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرلے۔

جس قسم کی تبدیلی قوم کے اندر (یعنے اس کی نفسیات) میں پیدا ہوگی، اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں رونما ہوگی۔ (ایمان، اسی قسم کی صحیح نفسیاتی تبدیلی کو کہتے ہیں) یہی وہ تبدیلیاں ہیں جن

سے مردہ اقوام کے اندر زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ (یُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۔ (۶/۹۵) ۔ اسی سے ایک قوم اپنی عظمت و شوکت کھو کر قعر مذلت میں گر جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورۃ توبہ میں خود جماعت مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ اگر تم تخریبی قوتوں کا پوری مستعدی سے مقابلہ نہیں کرو گے تو یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۔ (۹/۳۹) ۔ خدا کا قانونِ محو و ثبات تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے ۔ یہ نہیں کہ ایک قوم کی جگہ جو دوسری قوم آتی ہے تو وہ پہلی قوم جیسی ہی ہوتی ہے۔ اس قسم کا استبدال بے معنی ہے۔ یہ (آنے والی قوم) جانے والی قوم کی مثل نہیں ہوتی۔ اس سے بہتر ہوتی ہے، جبھی تو اس کی جانشین بنتی ہے۔ اسی لئے کہا کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی "لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۔ (۴۷/۳۸) ۔ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ مٹتی وہی قوم ہے جس کی تعمیری صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہو گیا ہو اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جس کا یہ پلڑا بھاری ہو۔ یہی قوموں کے استبدال و استخلاف کا ابدی قانون ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے قوم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی کا۔

ایک قوم تو ایک طرف رہی، قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اگر پوری کی پوری نوعِ انسانی ایسی ہو جائے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے، تو یہ بھی صفحۂ ارض سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے ۔ اور اس کی جگہ کوئی اور مخلوق لے لے۔

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۔ (۳۵/۱۶)

خدا کے قانونِ مشیت کی رُو سے یہ بھی ممکن ہے کہ (اگر تم میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے تو) وہ تمہیں ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک جدید مخلوق لے آئے۔

جب کسی قوم کی زندہ رہنے کی صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے اور وہ اس طرح، مصافِ زندگی سے ہٹا دی جائے تو اسے اُس قوم کی "اجل" کہا جاتا ہے۔ اور اس میں پھر ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔

وَ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۔ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُونَ ۔ (۷/۳۴)

ہر قوم اُس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو جب وہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے تو اُس کی مدتِ حیات بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد اس میں ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔

اور یہ کچھ یونہی علی الحساب نہیں ہو جاتا، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے — لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ۔ (۳۸/۱۳) ہر قوم کی اجل کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی اندھی قوت یا قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) کی جابرانہ گردش نہیں جس سے ایک قوم غلبہ وتسلط کی مالک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے اور اس میں، نہ مٹنے والی قوم کا کوئی جرم اور قصور ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی جگہ لینے والی قوم کی کوئی کاریگری۔ یہ محض گردشِ دولابی کی رُو سے بندھی ہوئی باریاں ہیں جو خود بخود آتی جاتی ہیں — قرآنِ کریم کے فلسفہ کی رُو سے، قومیں اپنے جوہرِ ذاتی کی بنا پر غلبہ واقتدار کی وارث ہوتی ہے۔ جب تک ان میں وہ جوہر باقی رہتا ہے، ان کا اقتدار بھی قائم رہتا ہے۔ جب اس جوہر میں کمی واقع ہو جائے تو وہ باقی رہنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے اور اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جو اس سے بہتر صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قانونِ اضداد اور قرآنی فلسفہ میں کس قدر نمایاں فرق ہے اور قرآنی فلسفہ کس طرح علم وبصیرت کو اپیل کرتا ہے۔

۲۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے

فلسفۂ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ:

۱۔ کائنات میں ماوراء مادہ کسی شے کا وجود نہیں۔

۲۔ ہر مادی شے میں عملِ اضداد جاری وساری ہے جس کی وجہ سے ہر شے ہر آن تغیر پذیر ہوتی ہے۔ کائنات میں ثبات وقرار کسی شے کو نہیں۔

لیکن، (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) اس کے ساتھ ہی، انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود یہ قانونِ اضداد ایک حقیقتِ مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) ہے۔ غیر متبدل (IMMUTABLE) ہے۔ ابدی (ETERNAL) ہے۔ اور نہ کسی شے کا پیدا کردہ ہے، نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج (OBJECTIVE) ہے۔

قرآنِ کریم کا فلسفہ یہ ہے کہ اس قسم کا غیر متبدل، موجود فی الخارج قانون ایک ہی نہیں۔ ایک سے زیادہ ہیں۔ ان قوانین کو دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شق قوانینِ فطرت پر مشتمل ہے جن کے مطابق سلسلۂ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ دوسری شق کا تعلق ان قوانین سے ہے جن کے مطابق انسان کو اپنی زندگی

بسر کرنی چاہیئے تاکہ اس کے طبیعی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی نشو ونما بھی ہوتی جائے۔ قانونِ فطرت ہر شے کے اندر از خود موجود ہوتا ہے اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ "مجبور" سے مطلب یہ ہے کہ اشیائے کائنات کو اس کا اختیار و ارادہ ہی نہیں دیا گیا کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکیں۔ انسانی زندگی سے متعلق قوانین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ قوانین جب نظری حیثیت سے سامنے آئیں تو انہیں کلمات اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جب ان کا ظہور عملی شکل میں ہو تو یہ سنت اللہ کہلاتے ہیں۔ کلمات اللہ ہوں یا سنت اللہ، سب غیر متبدل ہیں ــــ ایسے غیر متبدل کہ کائنات کی کسی شے کو (انسان سمیت) اس کی قدرت حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کر سکے، اور خود خدا جس نے ان قوانین کو اس قسم کا بنایا ہے، قدرت رکھنے کے باوجود، ان میں تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ خود اس کا ارشاد ہے کہ ــــ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۶/۳۴) قوانین خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)
تیرے رب کے قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح "سنت اللہ" کے متعلق فرمایا ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۔ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۔ (۳۳/۶۲)
خدا کا یہی دستور امم سابقہ میں بھی رہا۔ یہی اب کارفرما ہے۔ تم دستور خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

جن لوگوں کے سامنے ان قرآنی حقائق کو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا، وہ کہتے تھے کہ یہ محض شاعری ہے ــــ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) ــــ تھوڑا سا انتظار کرو۔ زمانے کی گردشیں اسے خود مٹا دیں گی یونہی حالات بدلے اور زمانے کے تقاضوں میں تبدیلی آئی، یہ باتیں داستانِ پارینہ ہو جائیں گی۔ ان سے کہا گیا کہ یہ شاعری نہیں۔ شاعری ایک دائمی انقلاب کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ (۳۶/۶۹)۔ یہ اٹل قوانین ہیں اس لئے ــــ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ ۔ (۵۲/۳۱) ــــ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ ابدی حقائق ہیں یا کسی شاعر کے تخیلات ــــ انہی میں وہ قانونِ محو و ثبات شامل ہے جس کے مطابق چیزیں مٹتی اور باقی رہتی ہیں ــــ یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۔ (۱۳/۳۹) ــــ اور ان کا سرچشمہ کائنات سے ماوراء علم خداوندی ہے۔ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ

الْكِتَابِ (۲/۱۳)۔ یہ قوانین دیئے اس لئے گئے ہیں۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲)۔ جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ ہے اور جسے تباہ ہونا اور مٹنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے مٹے۔ یہاں نہ دھاندلی ہے اور نہ ہی محض اتفاقی طور پر حوادث سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔

۷۔ مستقل اقدار

ان میں سے جن قوانین کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر انسانی معاشرہ ان اقدار کے مطابق متشکل ہو جائے تو اس میں تمام افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریاتِ زندگی بھی بلا مشقت و پریشانی پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ یہ دوہرا مقصد ان اقدار کے سوا اور کسی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان اقدار و قوانین کی فہرست تو طویل ہے لیکن ہم یہاں ان میں سے چند ایک بنیادی اقدار کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الاحترام ہے۔ (۱۷/۷۰)

۲۔ معاشرہ میں تعینِ مدارج کا معیار افراد کے ذاتی جوہر اور حسنِ سیرت و کردار ہے۔ نہ کہ اضافی نسبتیں۔ (۴۶/۱۹)

۳۔ معاشرہ میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے فرائضِ منصبی کا پابند ہے۔ (۴۹/۱۳)

۴۔ معاشرہ کے بنیادی ستون عدل اور احسان ہیں۔ عدل کے معنی ہیں ہر ایک کے حقوق اور واجبات کی کما حقہٗ ادائیگی۔ اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی آ جائے، اس کمی کا پورا کر دینا۔ (۱۶/۹۰) اور اس کے لئے مزد و معاوضہ تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی متمنی نہ ہونا۔ (۷۶/۹)

۵۔ اپنی جائز ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینا (۲/۲۱۹)، بلکہ اگر دیکھا جائے کہ دوسروں کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو اس کی ضرورت کو اپنے اوپر ترجیح دینا۔ (۵۹/۹)

۶۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (۵۳/۳۸)

۷۔ جس میں محنت کرنے کی استعداد ہے اسے محنت کئے بغیر کچھ نہیں مل سکے گا۔ (۵۳/۳۹)

۸۔ ذرائع رزق ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ (۱۰/۴)، (۵۵/۱۰)

۹۔ ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا معاشرہ کا فریضہ ہوگا۔ (۶/۱۱)، (۱۵۱/۶)

۱۰۔ کسی شخص کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ (۳/۷۸)، فرمانروائی صرف قوانین کی ہوگی (۱۲/۴۰)

۱۱۔ انسان کا کوئی کام ۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال تک بھی اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۲۹/۳۳) ان میں سے ہر ایک کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے اور انہی اثرات کے مجموعے کے مطابق اس کی ذات کا مستقبل متعین ہوتا ہے۔ اگر اس کا تعمیری نتائج کا پلڑا جھکا ہوا ہے تو اس کا مستقبل خوشگوار ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا ہے تو اس کے لئے تباہی ہے۔ اس قانونِ مکافات میں کسی کے لئے استثناء نہیں۔

ان قوانین یا مستقل اقدار کو الحق (THE TRUTH) کہا جاتا ہے۔ یہی حقیقت (REALITY) ہے۔ ان کے خلاف جو نظریہ، تصور یا مسلک ہے وہ باطل ہے۔ حق تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے اور انسانیت کے ارتقاء میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ باطل تخریبی نتائج پیدا کرتا ہے اور کاروانِ انسانیت کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری، اس کے تین بڑے ستون ہیں۔ حق و باطل میں شروع سے کشمکش چلی آرہی ہے اور چلی جائیگی۔ انسانی تاریخ، اسی کشمکش کی محسوس تفسیر ہے۔

۸۔ کشمکشِ حق و باطل

اب ہم پھر ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مادی جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی تصور میں بنیادی فرق ہے۔ فلسفہ جدلیت کی رو سے کوئی نظریہ، کوئی تصور، کوئی مسلک نہ بنیادی طور پر حق ہے نہ باطل۔ ہر نظریہ (IDEA) اور ہر شے کے اندر دو متضاد عناصر باہمدگر برسرپیکار رہتے ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا۔ جو غالب آجاتا ہے اس کی ضد پھر نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہی کشمکش پھر جاری رہتی ہے اور یہ سب کچھ (مارکس کے الفاظ میں) تاریخی وجوب (HISTORI-CAL NECESSITY) اور ماؤزے تنگ کی اصطلاح میں قانونِ اضداد کی اندھی قوت کی رو سے ازخود ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، قرآنی تصور یہ ہے کہ :

۱۔ یہ کشمکش، حق (تعمیری قوتوں) اور باطل (تخریبی قوتوں) کے درمیان ہوتی ہے۔

۲۔ اس کشمکش میں آخرالامر حق غالب آتا ہے، اور سلسلۂ کائنات ایک ارتقائی منزل اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس نئی منزل میں باطل پھر ہیئت بدل کر سامنے آتا ہے اور حق و باطل کا یہ تصادم پھر جاری رہتا ہے جس میں حق پھر غالب آجاتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا چلا آرہا ہے اور ہر منزل کے بعد کائنات اور نکھرتی اور سنورتی چلی جارہی ہے۔

۳۔ یہ کشمکش اور حق کا غلبہ، اس اسکیم کے مطابق جاری و ساری ہے جس کی رُو سے خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس کشمکش میں اگر انسان حق کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو یہ مرحلہ تیز رفتاری سے طے ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ مسافت اُس رفتار کے مطابق طے پاتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ (اس کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی۔)

۴۔ جو انسان حق کی حمایت کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور ان کی اس دنیا کی، اور اس کے بعد کی زندگی، خوشگواریوں کے جھولے جھولتی ہے۔ یوں خود انسان، اپنے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دیکھئے، قرآن کریم ان حقائق کو کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

۱۔ نظامِ کائنات یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا گیا۔ اِسے بالحق ـــــ تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۔ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۴۴/۳۸-۳۹)

اور ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان میں ہے، یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام نہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

۲۔ کائنات میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ اس تصادم میں آخرالامر باطل شکست کھاتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۔ (۲۱/۱۸)

ہم حق کی ضربیں باطل پر لگاتے رہتے ہیں۔ تاآنکہ حق، باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اسکے خلاف کچھ سمجھتے ہیں، تو ان کے حصے میں تباہی کے سوا کچھ نہیں آ سکتا۔ (کیونکہ وہ حق کے غلبہ کا تصور نہیں رکھتے)

۳۔ مفاد پرست گروہ باطل کو غالب رکھنے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔

وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ۔ (۵۶/۱۸)

جو لوگ حق سے انکار کرتے ہیں وہ باطل کے حیلوں سے حق کے خلاف نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرح حق کو مغلوب کر دیا جائے۔

۴۔ لیکن حق پرست جماعتیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اتر آتی ہیں۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ ۔ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۔ (۸/۸)

تاکہ حق کا اثبات ہو جائے اور باطل کا ابطال۔ خواہ ایسا ہونا ان لوگوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو قوانین شکنی ہی میں اپنا مفاد مضمر سمجھتے ہیں۔

۵۔ لیکن اگر حق کی حمایت کے لئے انسانوں کی جماعت نہ بھی اٹھے، تو بھی آخر الامر حق غالب آ کر رہتا ہے اگرچہ اس میں وقت بہت لگ جاتا ہے۔

وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۲۴/۴۲)

خدا، اپنے قوانین کے زور سے، باطل کو مٹا اور حق کو محکم اور استوار کئے جاتا ہے

یہ نکتہ مزید وضاحت چاہتا ہے۔ انسانی عمل کا ایک طریق تو یہ ہے کہ وہ کسی قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر اس کے مطابق کام کرنا شروع کر دے۔ اس سے اثبات حق کی مسافت بہت جلد طے ہو جائے گی، اور اس عمل کے نتائج اس قانون کی صداقت کی محسوس دلیل بن جائینگے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ کسی قانون یا فارمولے کو نہ مانے بلکہ اپنے قیاس کی راہ نمائی میں سفر شروع کر دے۔ قیاس عقلی کا طریق تجرباتی (TRIAL AND ERROR) کام ہوتا ہے۔ اس میں عقل ایک مسلک اختیار کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربہ کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ راہ غلط تھی۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس طرح متعدد تجارب، اور سینکڑوں برس کی جانکاہ مشقتوں کے بعد وہ حقیقت تک پہنچ پاتی ہے۔ اسے عرف عام میں زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کی یہ وہ رفتار ہے جس میں، "ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔" اب یہ انسان کے اپنے فیصلہ پر منحصر ہے

کہ وہ اپنے سفر کا آغاز ہی حقیقت (صداقت) کی راہ نمائی میں کرے اور اس طرح راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بھی محفوظ رہے، اور مسافت بھی برق رفتاری سے طے کرلے۔ یا عقل کے تجرباتی طریق کے مطابق ٹھوکریں کھاتا ہوا صدیوں کے بعد وہاں جاکر پہنچے۔ اول الذکر طریق سے حق، ایک ہی جست میں باطل پر غالب آجاتا ہے۔ ثانی الذکر طریق سے وہ صدیوں میں جاکر غالب آتا ہے۔ غالب بہرطور حق ہی کو آنا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ آخر الامر غالب، حق ہی نے آنا ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حق یونہی خلا میں غالب آجائیگا۔ حق سے مراد ہے حق پر مبنی نظام۔ یہ نظام انسانوں کی دنیا میں رائج ہوگا اور انسانی ہاتھ ہی اسے متشکل کرینگے۔ ایک جماعت اسے متشکل کرے گی اور دوسری جماعت اس کی مخالفت کرے گی۔ اس کی حمایت کرنے والی جماعت اگر مادی قوت کے اعتبار سے، فریق مخالف کے مقابلہ میں کمزور بھی ہوگی تو بھی اسے کامیابی ہوگی (قرآن کریم اس کمزوری کو ابتداءً ایک اور دو کی نسبت سے تعبیر کرتا ہے اور آخر الامر ایک اور دس کی نسبت سے)۔

(۶) یہ پرکھنے کے لئے کہ حق کس طرف ہے، بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

وہی نظریہ زندگی، وہی مسلک حیات، وہی نظام انسانی باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسان کے لئے منفعت کا موجب ہو۔

مفاد پرست انسانوں کی گروہ مندانہ منفعت کوششیں، اس اصول کو ناکام بنانے کے لئے مصروف جدوجہد رہتی ہیں لیکن خدا کی اسکیم اسے کامیاب و کامران بنا کر رہتی ہے۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ۔ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ ۔ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۹/۳۲)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نور خداوندی کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔ لیکن خدا کی مشیت ان کی ان کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دیگی۔ یہ نور اپنی تکمیل تک پہنچ کر رہے گا۔ خواہ مفاد پرست گروہوں پر یہ چیز کتنی ہی شاق کیوں نہ گزرے۔

یہی وہ نظام زندگی ہے جو باطل پر مبنی ہر نظام پر آخر الامر غالب آئے گا۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔ (۹/۳۳)

خدا نے اپنے رسول کو صحیح منزل کی طرف راہ نمائی دے کر بھیجا ہے۔ یعنی ایک ایسا نظام زندگی دے کر جو حق پر مبنی ہے۔ یہ نظام، دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر

رہیگا۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو خالص قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے۔

حق و باطل کی اس کشمکش کے نقطۂ نگاہ سے، دنیا میں انسانوں کی دو ہی جماعتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک حق کا غلبہ چاہنے والی ـــ اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ دوسری باطل کے غلبہ کی متمنی ـــ اسے کفار کا گروہ کہتے ہیں۔ یہ کشمکش انہی دو جماعتوں میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق پرست ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں لیکن درحقیقت چاہتے ہیں باطل کے ساتھ لپٹے رہنا۔ انہیں منافق کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ قرآن کریم کی رو سے، بدترین خلائق ہوتا ہے۔ یعنی کفار سے بھی بدتر۔

«شرک» حق اور باطل کے نظام میں مفاہمت (COMPROMISE) کو کہتے ہیں جس کی، نظامِ حق میں قطعاً گنجائش نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے اس نظام کے داعیٔ اول (حضور نبی اکرمؐ) سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (۱۱/۱۱۳)

یہ لوگ جو عدل کے بجائے، ظلم پر مبنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تو تم ان کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو جس جہنم میں یہ گرفتار ہیں اس کی آگ کے شعلے تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لینگے۔

حق و باطل کے اضداد میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حق کے ساتھ باطل کی ذرا سی بھی آمیزش ہوجائے، تو حق، حق نہیں رہتا۔

قرآنی تصور کی رو سے حق اور باطل کے تضاد کی کیفیت یہ ہے۔ دوسری طرف فلسفۂ جدلیت ہے جو یہ تصور پیش کرتا ہے کہ دو باہمدگر متخاصم قوتیں کچھ وقت کے بعد ایک دوسرے میں تبدیل ہوجاتی ہیں ـــ یعنی کچھ عرصہ کے بعد، حق ـــ باطل ہوجاتا ہے اور باطل حق ہوجاتا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کے اس فلسفہ کو (کہ حق ہمیشہ حق رہتا ہے اور باطل، باطل) وہ ماوراء الطبیعاتی (METAPHYSICS) سے تعبیر کرتے ہیں جس کی ضد، فلسفۂ جدلیت ہے۔ اس لئے اس بنا پر ہمیں ان کے فلسفہ پر تنقید کرنے کا حق نہیں۔ ہم اس دلیل کو تسلیم کرلیتے .... لیکن انہی کا یہ بھی تو دعویٰ ہے کہ قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) ایسا حق ہے جو باطل میں تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے دہی ہے اور ابد تک وہی رہے گا۔ یہ خود (METAPHYSICS) ہے۔ لہٰذا، بات صرف اتنی ہوتی کہ فلسفۂ جدلیت، ایک قانون کو غیر متبدل تسلیم کرتا ہے، قرآن ایک

سے زیادہ قوانین کو ایسا کہتا ہے۔ اس کے اس دعویٰ کی دلیل بھی وہی ہے جو دلیل وہ پیش کرتے ہیں۔ یعنے استنتاجی دلیل (PRAGMATIC TEST)۔ اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ جب علم سے متعلق گوشہ سامنے آئے گا۔

بہرحال یہ ہے وہ نظام جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ نظام زندگی جس میں مستقل اقدار حیات یا غیر متبدل قوانین محسوس عملی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ نظام زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے مکان کی حدود سے اس طرح کہ یہ عالمگیر نظام ہے جو کسی خاص خطۂ زمین میں محدود نہیں رہ سکتا، نہ ہی کسی خاص قوم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں نظام ہے۔ جہاں تک زمان کا تعلق ہے۔ اس نظام کے محسوس پیکر میں تو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس کی اصل و بنیاد ہمیشہ وہی رہتی ہے۔ یعنی وہ غیر متبدل قوانین جن پر اس کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے دین کہا جاتا ہے۔

۹۔ اضداد میں توافق

حق و باطل کی کشمکش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو ان جماعتوں کے درمیان جو حق و باطل کی حامی ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسرے، افراد کے سینے کے اندر (داخلی کشمکش) جس میں ایک طرف انسان کے بیباک جذبات، طبیعی مفاد کے حصول کے لئے ہیجان خیز رہتے ہیں اور دوسری طرف اس کی ذات کی نشو و نما کے تقاضے حق کی حمایت کے داعی ہوتے ہیں۔ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کا تصور، انتہائی غلط نگہی اور خود فریبی ہے۔ جذبات ہی تو وہ قوتِ محرکہ ہے جو انسان کو آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ قرآن کا انداز تربیت یہ ہے کہ وہ جذبات کو مستقل اقدار کے تابع سرگرمِ عمل رہنا سکھاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے الفاظ میں، "اس طرح ابلیس مسلمان ہو جاتا ہے"۔ اس سے ان افراد کے سینے کا داخلی اضطراب مبدل بہ سکون ہو جاتا ہے۔ یہ نظام انہی افراد کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے ... ... اس کیفیت کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ — لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ — (۶/۱۲۷)— خدا کی صفتِ ربوبیت کے زیر سایہ انہیں ایسا مقام حاصل ہوگا جس میں ہر سمت سے سلامتی کی آوازیں وجد آفریں ہوں گی۔ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ — (۱۰/۱۰)— اس وقت انسان کے ارضی معاملات اور سماوی اقدار (غیر متبدل قوانین) ایک ہی مرکز میں مرکوز ہوں گے۔ (۳۹/۴۲) اور انسانی معاشرہ کی حالت یہ ہوگی کہ — لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا — کسی انسان کا دوسرے انسان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوگا — وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ

لِلّٰہِ۔ (۸۲/۱۹) حکومت انسانوں کی نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔

وَ اَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا۔ (۳۹/۶۹)

اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

۱۰۔ علم کے متعلق تصوّر

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فلسفۂ جدلیت کی رُو سے، علم وہی علم کہلانے کا مستحق ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل کیا جائے۔ اور نظریہ وہی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کی تائید اس کے نتائج کریں۔ اس عملی طریق سے انسان بتدریج قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرے گا۔ حقائق انہی قوانین کو کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم بھی انسانی علم اسی کو قرار دیتا ہے جسے حواس (SENSE PERCEPTION) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ

وَ لَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا۔ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور قلب، ہر ایک سے پوچھا جائے گا (کہ انہوں نے اس بات کے علم ہونے کی شہادت دی تھی یا نہیں)

یعنی حصولِ علم کے لئے ضروری ہے کہ انسانی حواس معلومات حاصل کر کے قلب (MIND) تک پہنچائیں اور وہ ان سے کوئی نتیجہ مستنبط کرے۔ چنانچہ قرآن کریم قدم قدم پر مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ وہ "علماء" کہتا ہی انہیں ہے جو کارگہ فطرت کے مشاہدہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس میں قوانینِ خداوندی کس حسن و خوبی سے کارفرما ہیں۔ (۳۵/۲۷-۲۸)۔ نظامِ فطرت کے ساتھ ہی وہ انسانی تاریخ کے مطالعہ پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں پر غور کرو اور دیکھو کہ جس قوم نے زندگی کے صحیح قوانین کے مطابق نظام متشکل کیا اس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس نے غلط راہ اختیار کی اس کا انجام کیا ہوا۔

نظامِ فطرت کے مشاہدہ اور تاریخِ انسانی کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر انسان پہنچے، قرآن اسے ایک نظریہ قرار دیتا ہے۔ وہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اسے پرکھنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ اس نظریہ پر عمل کر کے

دیکھو۔ اگر اس کے نتائج، اس کے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں تو وہ نظریہ صحیح ہے۔ اگر نتیجہ اس کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ نظریہ درست نہیں۔ یہی وہ طریق تھا جسے خود نبی اکرمؐ نے اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپ نے اپنی قوم مخالف سے کہا کہ میں نے قوانین خداوندی تمہارے سامنے پیش کر دیئے۔ اب انکی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۱۳۶)

ان سے کہو کہ اے میری قوم! تم اپنے طریق پر عمل کرو، میں اپنے طریق پر عمل کرتا ہوں نتائج خود بخود بتا دینگے کہ منزل تک کون پہنچتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ جو لوگ دوسروں کی محنت کو غصب کر کے ظلم کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جس دعویٰ کا اثبات اس کے عملی نتائج ..... نہیں کرتے وہ دعویٰ صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے حقیقت تک پہنچنے کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ جہاں تک منتقل اقدار کا تعلق ہے، اس طویل مدت کو مختصر کرنے کے لئے خالق کائنات کی طرف سے ایک اور طریق تجویز کیا گیا۔ اسے وحی کہا جاتا ہے۔ یعنی ان قوانین کو کسی انسان پر براہِ راست منکشف کر دیا جاتا اور وہ انہیں دوسرے انسانوں تک پہنچا کر ان سے کہتا کہ تم ان پر عمل کر کے خود ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کر لو۔

وحی کا یہ سلسلہ چودہ سو سال ہوئے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لہٰذا، اب انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ و مشاہدہ اور فکر و شعور کے علاوہ کوئی نہیں۔ وحی کے ذریعے جو علم آخری مرتبہ دیا گیا تھا، وہ اپنی اصلی شکل میں قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تم ان قوانین پر غور و فکر کرو اور ان پر عمل کر کے دیکھو اگر اس طرح تمہیں ان کی صداقت کے متعلق اطمینان ہو جائے تو انہیں صحیح تسلیم کرو۔ غور و فکر سے انسانی ذہن ایک نظریہ کے متعلق اتنا اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ مبنی بر حقیقت ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے اس طرح مبنی بر صداقت خیال کرے تو یہ بات اسے اس پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اس پر عمل کر کے دیکھے۔ اس وقت اس نظریہ کے نتائج ہنوز اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ اس طرح اَن دیکھے نتائج پر اعتماد کر کے، آمادۂ عمل ہو جانے کو "ایمان بالغیب" کہتے ہیں۔ یعنی اُن نتائج پر یقین جو ہنوز مشہود طور پر سامنے نہیں آئے۔ یہ یقین اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر انسان، اس کے مطابق عملی قدم اٹھانے کے لئے بطیبِ خاطر تیار نہیں ہو سکتا۔ جب نتائج اس دعویٰ کی تائید کر دیں تو وہی "ایمان بالغیب" حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں پہلے درجہ کے یقین کو علم الیقین کہا جاتا ہے اور دوسرے درجہ کے یقین کو عین الیقین (۱۰۲) یعنی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے علم کی تعریف (DEFINITION) اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔ وہ کہتا ہے کہ جو قوانین یا مستقل اقدار تمہارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ تم ان پر عقل و فکر اور دلیل و برہان کی رُو سے غور کرو۔ اگر وہ تمہیں قابل قبول نظر آئیں تو ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کرو۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ان قوانین کی صداقت کی زندہ شہادت بن جائیں گے۔ (۵۵/۲) یوں وہ انسان کو اس محنت شاقہ سے بچا لیتا ہے۔ جو عقل کے تجرباتی طریق سے منزل تک پہنچنے کے لئے لابنفک ہوتی ہے۔

فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے یہ ساری فلسفیانہ بحث اس لئے کی ہے، کہ کمیونزم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے معاشی نظام کی بنیاد فلسفہ جدلیت پر ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ یہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ اس نظام کے لئے قرآن کا فلسفہ حیات ہی اساس محکم عطا کر سکتا ہے۔ اس لئے انسانیت کی نجات کی راہ یہ ہے کہ قرآنی فلسفہ کی بنیادوں پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار کی جائے۔ دونوں فلسفے ہمارے سامنے آ گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مادی جدلیت کا فلسفہ اس عمارت کے بوجھ کا متحمل کیوں نہیں ہو سکتا۔

مادی فلسفہ، خواہ وہ جدلیت کا ہو یا ماوراء الطبیعاتی، اس کا فطری نتیجہ نظامِ سرمایہ داری کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ مادی فلسفہ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی صرف حیوانی ہوتی ہے اور قوانینِ فطرت کے تابع رہتی ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں جن کا اطلاق، دیگر حیوانات پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح انسان پر۔ اس طرح اس فلسفہ کی رُو سے انسانی زندگی کے تقاضے محض طبیعی تقاضے ہوتے ہیں۔

طبیعی زندگی کے تین تقاضے ایسے ہیں جنہیں بنیادی یا جبلّی (INSTINCTIVE) قرار دیا جاتا ہے۔

(۱) تحفظِ خویش کا تقاضا (SELF - PRESERVATION)

(۲) تغلبِ خویش کا تقاضا (SELF - AGGRESSION) — یہ درحقیقت تقاضا (۱) ہی کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور

(۳) افزائشِ نسل کا تقاضا (SELF - REPRODUCTION)

تقاضا (۱) کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرد، زیادہ سے زیادہ سامانِ زیست سمیٹنے کی فکر کرے، تاکہ اس سے اس کا زیادہ سے زیادہ تحفظ ہو سکے۔ اگر اس مقصد کے حصول میں اس کے راستے میں کوئی حائل ہو جائے تو یہ اس کا مقابلہ کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تقاضا (۲) ہوا۔ اور جب اپنے تحفظ کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر اپنی اولاد کے تحفظ کی فکر کرے۔ یہ تقاضا (۳) ہے۔ اس تصورِ زندگی کے ماتحت، کسی فرد کے لئے، کسی دوسرے فرد کے تحفظ یا مفاد کا سوال پیدا ہو نہیں سکتا۔ کوئی حیوان کسی دوسرے حیوان کے مفاد کا تصور نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک حصولِ مفادِ خویش کے علاوہ کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں، ہو سکتا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس فلسفہ کا ماننے والا اس سوال کا اطمینان بخش جواب کبھی نہیں دے سکتا کہ

میں دوسروں کی مدد کیوں کروں ؟

آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا تقاضا باہمی تعاون ہے۔ یعنی میرے لئے کسی محتاج کی مدد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر کل کو میں محتاج ہو جاؤں تو دوسرے میری مدد کریں۔ لیکن ایسا کہتے وقت یہ نہیں سوچا جاتا کہ یہی جذبہ تو وہ ہے جس کے تابع ہر شخص زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے یعنی وہ ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ یہی وہ منافست (RACE) ہے جو ایک فرد کی حالیہ ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی اسے اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ وہ ہر وقت سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور اسی سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زیادہ عقل و ہنر (WITS) کے مالک زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتے ہیں اور دوسرے بیچارے محتاج سے محتاج تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو زیادہ سمیٹ لیتا ہے وہ دوسروں کے تعاون کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس تعاون کو روپے سے خرید سکتا ہوں۔ اس لئے تعاون کی ضرورت اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسروں کی امداد کرے۔ اسی کا نام سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ یہ مادی فلسفۂ زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

فلسفۂ جدلیت، انسانی زندگی اور اس کے تقاضوں کا تصور تو یہ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس بنیاد پر معاشی نظام وہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ ایثار کرنا پڑتا ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ:

> ہر شخص سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے اور اس میں سے اُسے بقدر اُس کی ضرورت کے دے کر باقی تمام دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے لے لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ (مادی تصورِ حیات کی رو سے) وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہے جس کے ماتحت ایک فرد زیادہ سے

زیادہ محنت کرے اور اس میں سے کم ازکم خود لے کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دے دے۔ اس قسم کا مطالبہ زندگی کے طبیعی تقاضے کے خلاف ہے۔ تحفظِ خویش کی جبلت (INSTINCT) اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی یہ اس مطالبہ کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ ہنگامی طور پر عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے (جو نشہ پلا کر مدہوش کرنے ہی کی دوسری شکل ہوتی ہے) اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ مفادِ خویش کو نظرانداز کر دیں۔ لیکن اسے ان کا مستقل نہج زندگی نہیں بنا سکتے۔ روس کا تجربہ اس کا شاہد ہے۔ انہوں نے عوام (محتاجوں اور غریبوں کو) یہ کہہ کر کہ "اٹھو اور امیروں کو لوٹ لو۔ ان کی دولت وحشمت کے مالک تم بن جاؤ گے" انہیں بے پناہ قربانیوں کے لئے آمادہ کر دیا۔ انہوں نے اس نشہ سے مدہوش ہو کر ہنگامی طور پر وہ کچھ کر دیا جسے دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ لیکن جب ان کا نشہ اتر گیا تو ایثار اور قربانی کا وہ جذبہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جب ان محنت کشوں سے کہا گیا کہ تم ... زیادہ سے زیادہ محنت کرو اور اس میں سے صرف بقدر اپنی ضرورت کے لو۔ تو انہوں نے کہا کہ سرکار! پھر اس میں اور قدیم نظامِ سرمایہ داری میں کیا فرق ہے؟ اس میں کارخانہ دار ہم سے زیادہ سے زیادہ محنت کرا تا تھا اور ہمیں بقدر ہماری ضروریات کے دیتا تھا۔ یہی کچھ اب آپ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کریں؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا نظام قائم رکھنے کے لئے "ڈنڈے" سے کام لینا چاہا۔ یہ کچھ وقت کے لئے تو چلا لیکن پھر ناکام رہ گیا۔ کوئی نظام قوت کے بل بوتے پر مسلسل نہیں چل سکتا۔ اس سے مجبور ہو کر روس والوں کو اپنے نظام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ یہ جو وہاں اپنے موقف سے رجعت ہوئی ہے — جسے چین' تحریف (REVISIONISM) قرار دے رہا ہے — یہ کسی سیاسی دباؤ یا مصلحت کا پیدا کردہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیادی کمزوری کا فطری نتیجہ ہے۔ چین ابھی اس منزل میں نیا نیا داخل ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مقام یوں سمجھئے کہ وہی ہے جو لینن کے زمانے میں روس کا تھا۔ اس لئے اسے ابھی اس تحریف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب یہ بحران ختم ہو جائے گا تو وہاں (چین میں) بھی وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو روس میں پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد یہاں بھی وہی ہے جو روس میں تھی۔ یہ کسی خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیادی کمزوری کا لازمی ثمر ہے۔ چنانچہ ماؤزے تنگ کو ابھی سے اس احساس نے ستانا شروع کر دیا ہے کہ چین کی نئی نسل کمیونزم کے مسلک سے ہٹتی جا رہی ہے۔ اسے سنبھالنا چاہیئے۔ اس کے لئے وہاں نوجوانوں پر مشتمل حفاظتی عسکر (RED GUARDS) کے ہاتھوں از سرِ نو اس انقلابی جدوجہد کو شروع کرایا جا رہا ہے جس میں ماؤزے تنگ اور اس کی پارٹی کے دیگر رفقاء گزرے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس تحرک (IMPETUS) سے یہ نظام چند قدم اور آگے نکل جائے لیکن اس سے اسے استحکام اور بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کی

بنیادی کمزوری ہے جو خارجی محرکات سے رفع نہیں کی جا سکتی۔

اس کے برعکس، قرآن کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ

(۱) انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ انسان، جسم کے علاوہ ایک اور شے سے بھی عبارت ہے جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) مقصدِ زندگی جسم کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ہے اور ذات کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی۔ اگر ان دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ نہ ہو تو ہو المراد — لیکن اگر ان میں کسی وقت ٹکراؤ ہو جائے تو پھر ذات کے تقاضوں کو جسم کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے گی۔

(۳) ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ جسم کی موت کے بعد زندہ رہ کر آگے بڑھتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرتے چلی جاتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۴) جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ خود اپنے استعمال میں لائیں۔ مثلاً آپ کے جسم کی پرورش صرف اس شے سے ہوگی جسے آپ خود کھائینگے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشو و نما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دے دیں۔ بالفاظ دیگر، جسم کی نشو و نما "لینے" سے ہوتی ہے اور ذات کی نشو و نما "دینے" سے۔ قرآن کے الفاظ میں — اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی۔ (۹۲/۱۸) یعنے اس شخص کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے جو اپنی چیزوں کو دوسروں کی نشو و نما کے لئے دے دیتا ہے۔

یہ ہے وہ فلسفۂ حیات، جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اس کے معاشی نظام کے اصولی خط و خال یہ ہیں:

(۱) خدا نے سامانِ زیست تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس لئے ذرائع پیداوار پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا خدا کے مقابلہ میں دوسرے خدا کھڑے کر دینے کے مرادف ہے۔

(۲) چونکہ اصل مقصدِ حیات، انسانی ذات کی نشو و نما ہے اور وہ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کی نشو و نما کے لئے زیادہ سے زیادہ دے۔ اس لئے اس نظام میں، ہر فرد کی خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمائے، اپنی کمائی کے ماحصل میں سے، اپنی بنیادی طبیعی ضروریات پوری کرنے کے بعد، باقی سب دوسروں کی نشو و نما کے لئے دے دے۔ (یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔

قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹) "یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری بنیادی ضروریات سے زاید ہے (سب کا سب)، تاکہ اس سے اس کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشو ونما ہو جائے۔ اس عمل (PROCESS) کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس وقت زکوٰۃ کا مفہوم صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ سرمایہ دار جس قدر جی چاہے سمیٹتے چلے جائیں لیکن اس میں سے اڑہائی فیصد خیرات کر دیں لیکن قرآن کی رُو سے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ زکوٰۃ کے معنی نشو ونما ہیں۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں ــ دوسروں کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچانا ــ یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ (۲۲/۴۱)، اس میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشو ونما کے لئے دیئے جاتا ہے ــ حتےٰ کہ (اگر ایسا موقعہ آپڑے) تو وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے (۵۹/۹) ــ وہ یہ کچھ کسی خارجی دباؤ یا سیاسی مصلحت کے ماتحت نہیں کرتا۔ یہ اس کی ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں وہ زیادہ سے زیادہ اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنے زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشو ونما کے لئے دیئے جانے) کا جذبہ محرکہ حیاتِ آخرت پر ایمان کے علاوہ کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ (۲۷/۳)۔ یہ صرف اسی تصورِ حیات کے ماتحت ممکن ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اپنی ضروریات سے زاید سب کچھ دوسروں کی نشو ونما کے لئے دے دے۔ (دوسروں سے مراد اپنی جماعت کے افراد ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی ہے)

اور جب اپنی ضروریات سے زاید سب کچھ دوسروں کے لئے دے دیا جائے گا تو فاضلہ دولت (SUR - PLUS - MONEY) ــــ جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے ــــ کسی کے پاس بچے گی ہی نہیں۔ نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوگا، نہ ہی روپیہ سمیٹنے کے لئے باہمی دوڑ (RACE) ہوگی۔ اس میں جو منافست (RACE) ہوگی، وہ زیادہ سے زیادہ کام کر کے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دینے کے لئے ہوگی۔ (۸۳/۲۶)

یہ ہے وہ فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ آپ غور کیجیے کہ ان ہر دو فلسفہ ہا میں سے کون سا فلسفہ ایسا ہے جس کی بنیادوں پر وہ نظام قائم رہ سکتا ہے جس کا تصور کمیونزم پیش کرتی ہے۔ وہ صرف قرآن کے فلسفۂ حیات کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، فلسفۂ جدلیت میں دوسرا النقص یہ ہے کہ اس میں قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) کے علاوہ کسی قانون، کسی تصور، کسی نظام کو غیر متبدل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کا تصور یہ ہے کہ قانونِ اضداد کی رُو سے ایک نظام ظہور میں آجاتا ہے۔ پھر اس میں

اس کی ضد کھڑی ہو جاتی ہے اور دونوں میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد وہ پہلا نظام مغلوب ہو جاتا ہے اور دوسرا غالب آجاتا ہے۔ پہلے نظام کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے نظام کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گردشِ دولابی اسی طرح سے جاری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح جاری رہے گی۔ اس وقت، اس گردش کی رُو سے، سابقہ نظام سرمایہ داری پر اس کی ضد (نظامِ سوشلزم) غالب آرہا ہے (اس کی اگلی منزل کمیونزم ہوگی) اب اسے محض اتفاق سمجھئے کہ ہم اس زمانے میں پیدا ہوتے ہیں جب اس نظام کے غلبہ کی باری ہے جو مزدوروں اور محنت کشوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس میں نہ مارکس کی فکر کا کوئی دخل ہے، نہ لینن کی عملی کار فرمائی کا۔ نہ روس کا کوئی کمال ہے، نہ چین کا اعجاز ــــ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ایسا ہونا تھا۔ ایسا ہو رہا ہے اس کے بعد جب گردش کا دوسرا رخ آئیگا تو یہ نظام مٹ جائے گا اور اس کی جگہ اس کی ضد کوئی دوسرا نظام لے لیگا۔ اُس وقت روس اور چین تو ایک طرف، ساری دُنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس قسم کے عادلانہ معاشی نظام کو برقرار رکھ لیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت اگر نظام سرمایہ داری مٹ رہا ہے، تو اس لئے نہیں کہ وہ نظام عدل و انصاف پر مبنی نہیں تھا اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی اور اس کی جگہ سوشلزم کا نظام برسرِ اقتدار آرہا ہے تو یہ بھی اسلئے نہیں کہ یہ نظام نوعِ انسان کے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ یہ تو صرف اپنی اپنی باری کا سوال ہے۔ اُس کی باری ختم ہو رہی ہے اس لئے وہ جا رہا ہے۔ اس کی باری آرہی ہے اس لئے یہ آرہا ہے۔ کل کو جب اس کی باری ختم ہو جائے گی تو یہ بھی چلا جائے گا اور مزدوروں اور محنت کشوں کی ہزار آہ و فغاں اور اُن کے حامیوں کی لاکھ سعی و کاوش بھی اسے برقرار نہیں رکھ سکیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کمیونزم کی طرف سے دنیا کے سامنے اس کا معاشی نظام پیش کیا جا رہا ہے اس کا فلسفہ نہیں۔ اس نظام کے متعلق بدلائل و شواہد بتایا جا رہا ہے کہ یہ، سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں انسانیت کے لئے آیۂ رحمت ہے (اور یہ واقعہ بھی ہے) سوال یہ ہے کہ جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی۔ اور یہ اپنی مسند خالی کر رہا ہوگا اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے رہا ہوگا جو اس کی ضد ہوگا تو اس وقت کمیونزم کے حامی دنیا کو کیا کہیں گے؟ اس وقت ان کے تمام دلائل و شواہد، جو یہ موجودہ نظام (کمیونزم) کے حق میں پیش کر رہے ہیں، سب باطل قرار پا جائیں گے۔ اُس وقت انہیں بھی اُس آنے والے نظام کی حمایت کرنی ہوگی۔ ورنہ جو درگت اِس وقت نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی بن رہی ہے، وہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوگا۔ اس لئے کہ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا قصور اتنا ہی ہے ناکہ وہ جدید نظام کا ساتھ نہیں دے رہے، جانے والے نظام کے ساتھ لپٹے ہوتے ہیں۔ اگر اُس وقت کمیونزم کے حامیوں نے اس جدید

نظام کا ساتھ نہ دیا، تو وہ بھی اسی جرم کے مرتکب قرار پائینگے جس جرم کی بنا پر اس وقت نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کو موردِ الزام قرار دیا جا رہا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت ماؤزے تنگ اپنی قوم کو کمیونزم کے معاشی نظام کی برکات کی بنا پر اس مقام تک لے آیا ہے۔ کل کو جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی تو پھر اس قوم سے کیا کہا جائے گا اور ان کے لئے وجہ جامعیت کیا چیز ہوگی؟

اصل یہ ہے کہ ماؤزے تنگ کا فلسفہ اضداد، فلسفہ جبریت (DETERMINISM) ہی کی ایک شاخ ہے جس کی رُو سے انسان کی حیثیت کائنات کی عظیم مشینری میں ایک بے بس پُرزے سے زیادہ کچھ نہیں، جو مشین کی حرکت کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ یونان کی فکر گاہوں سے اُبھرا اور انسانیت کو تباہ کرتا ہوا مختلف بھیس بدل کر یہاں تک آپہنچا ہے۔ یہی وہ فلسفہ تھا جس سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے تناسخ (آواگون) کا عقیدہ وضع کیا اور عیسائیت نے "اولین گناہ (ORIGINAL SIN)" کے کلنک کا ٹیکہ انسانیت کی پیشانی پر لگایا جو کسی کے دھوئے دُھل نہیں سکتا۔ مغرب کے مفکرین اور سائنس دانوں نے عیسائیت کو تو خیرباد کہہ دیا لیکن وہ اس کے اس فلسفہ کے چکر سے نہ نکل سکے۔ چنانچہ ان کی ہر تحقیق کا رُخ اسی طرف جاتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسی سے ہیگل متاثر تھا اور یہی مارکس بیچارے کے اعصاب پر سوار رہا۔ اب یہی تصورِ فلسفہ اضداد کے روپ میں سامنے آیا ہے جس میں نظام خود بخود بدلتے رہتے ہیں اور انسان، ہر آنے والے نظام کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ نہ اس کی برائیاں، کسی مروجہ نظام کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں، نہ اس کی اچھائیاں، اس کا کچھ سنوار سکتی ہیں۔

اس کے برعکس قرآن یہ کہتا ہے کہ ایک نظام فی ذاتہٖ اچھا ہوتا ہے اور دوسرا نظام فی ذاتہٖ خراب ہوتا ہے۔ جو اچھا ہوتا ہے اس میں قائم رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جو خراب ہوتا ہے وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اچھے نظام کا معیار یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

جو نظام تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہی نظام اچھا ہوتا ہے اور اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۱۳۵) جو نظام سلب و نہب اور ظلم و جور پر مبنی ہوگا اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ محو و ثبات کا یہ قانون غیر متبدل ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ بات ساری وقت (TIME) کی ہے اگر انسانوں کی جماعت اس کے لئے اٹھ کھڑی

ہوگی، تو یہ ظلم پر مبنی نظام جلدی مٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو (اس) میں وقت لگ جائے گا۔ قرآن کریم نے اس کی ایک مثال بھی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نظامِ جاگیرداری (FEUDAL SYSTEM) جس میں زمین کے بیحد و نہایت رقبے افراد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں، ظلم پر مبنی نظام ہے۔ یہ مٹ کر رہے گا۔ خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے ایسا بتدریج ہوگا۔

وَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ ۭ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۳/۴۱)

کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو جاگیرداروں کی ملکیت سے کم کرتے جا رہے ہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جسے کوئی پلٹا نہیں سکتا۔ وہ بہت جلد حساب کر دیتا ہے (لیکن اس کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔)

لیکن جب عہدِ نبی اکرمؐ میں جماعتِ مومنین اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، تو وہی انقلاب جسے اپنی رفتار سے ہزاروں سال میں جا کر مکمل ہونا تھا، چند سال کے عرصہ میں ظہور میں آگیا عہدِ نبی اکرمؐ میں زمین کو بٹائی، یا کرایہ پر دینے کی ممانعت کر دی گئی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام زمین، نظامِ معاشرہ کی تحویل میں آگئی۔ اس کے بعد جب اس جماعت کے جانشینوں نے اس قانونِ خداوندی سے اعراض برتا۔ تو اس قانون نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے چلنا شروع کر دیا، اور اب یہ صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پھر عملاً متشکل ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہی مثال دوسرے غلط نظامہائے حیات پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ ہے قرآن کا پیش کردہ قانونِ محو و ثبات ــــ یہ تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی پیدا کردہ گردشِ دولابی نہیں۔ اس میں اصول یہ ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰي مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) ــــ جو مٹتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے مٹتا ہے، جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہتا ہے۔ اور وہ دلیل و برہان یہ ہے کہ۔

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

زندہ وہ رہتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس نقطۂ خیال سے بھی آپ دیکھئے کہ جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی فلسفہ میں سے کس میں اسکی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے نظام کو قائم کر سکے اور باقی رکھ سکے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو!

حرفِ آخر

نظامِ کائنات پر غور کرنے سے چند ایک اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً۔

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی کی نمود سے پہلے ہی یہاں سامانِ زیست موجود تھا اور موجود چلا آرہا ہے۔ زندگی خواہ اوّلین جرثومہ کی شکل میں ہو اور خواہ بلند ترین حیوانی پیکر میں، جن اشیاء پر اس کے قیام و بقا کا انحصار ہے ـــــ پانی، روشنی، حرارت، ہوا، خوراک وغیرہ ـــــ وہ سب کچھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی اتفاقاً وجود میں نہیں آگیا، یہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت کارفرما ہے اور سراسر حکمت پر مبنی۔

(۲) یہ سامانِ زیست ان اشیاء کا خود پیدا کردہ نہیں، کسی اور کا عطا کردہ ہے۔ یعنی جس نے انہیں زندگی دی ہے اس نے سامانِ زندگی بھی پیدا کر دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔

(۳) صفحۂ ارض پر کوئی شے (انسان کے علاوہ) ایسی نہیں جو سامانِ زیست کو انفرادی ملکیت میں لے بیٹھے۔ وہ صرف اس سے اپنی ضرورت پوری کرتی ہے ـــــ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا۔ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ۔ (۲۹/۶۰) ـــــ ذرا سوچو تو سہی کہ کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں۔ سامانِ زیست، مائدۂ ارض پر تمہارے لئے اور انکے لئے بکھرا پڑا ہے۔

ان میں سے جو ذی حیات رزق کا ذخیرہ بھی کرتے ہیں (مثلاً چیونٹیاں یا شہد کی مکھیاں وغیرہ) تو وہ بھی ان سب کی اجتماعی ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال وہاں بھی نہیں ہوتا۔

(۴) انسانوں کے لئے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنا منشائے فطرت تھا۔ اسے قرآن (قصۂ آدم کے تمثیلی رنگ میں) اس زمین پر جنت کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ زندگی جس میں کیفیت یہ ہو کہ:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔ (۲۰/۱۱۸)

اس میں تجھے نہ بھوکے رہنے کا غم ستائے نہ پیاس پریشان کرے، نہ اسمیں

لباس کے لئے متفکر ہونا پڑے، نہ مکان کے لئے سرگرداں۔

اس میں کیفیت یہ ہونی چاہیئے کہ — وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) جہاں کسی کو ضرورت ہو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔ ذرائع رزق ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ۔ (۴۱/۱۰)

(۵) لیکن انسان کی مفاد پرستیوں نے، سامانِ زیست پر انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کر کے اس جنت کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ اس بستی کو قرآن نے ہبوطِ آدم سے تعبیر کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فرد دوسرے کا دشمن ہو گیا۔ (وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ (۲/۳۶)

(۶) اب مقصودِ فطرت یہ ہے کہ انسانی دنیا میں پھر سے وہی جنتی زندگی کا نقشہ قائم ہو جائے۔ اور اسطرح "جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے جنت کو پالے"۔ خدا کا کائناتی قانون، اسی نقشہ کو قائم کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس کی رفتار (ہمارے حساب شمار کے مطابق) بہت سست ہے۔ اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔

اس رفتار کو تیز کرنے کے لئے آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعی حضرات انبیاء کرامؑ وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اس نقشہ کو قائم کرتے — یعنی سامانِ زیست کو تمام افراد انسانیہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عام کر دیتے۔ (اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے) — لیکن ان کے بعد مفاد پرست گروہ پھر آگے بڑھ آتا۔ اور اس نقشہ کو الٹ کر پھر سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر تا — یہ کچھ ایسے لوگوں کی مدد سے ہوتا، جو مقدس لبادوں میں ملبوس ہو کر عوام سے کہتے کہ منشاء خداوندی بھی یہی ہے۔ انہیں مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔

آخری مرتبہ "وہ جنتی نقشہ" خدا کے آخری نبی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں متشکل ہوا اس کے کچھ عرصہ بعد، مفاد پرست گروہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی شکل میں پھر آگے بڑھ آیا انہوں نے باطل کا نظامِ سرمایہ داری قائم کر دیا اور خدا کا کائناتی قانون پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔

اب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لئے اب اس جنتِ ارضی کی تشکیل کی دو صورتیں تھیں

(ا) جس اُمت کو اس آخری نبیؐ کے پیغام (قرآن) کا وارث قرار دیا گیا تھا، وہ اس نظام کو اپنے دست و بازو سے قائم کرتی اور باقی رکھتی — اور اگر وہ ایسا نہ کرتی — تو

(ب) زمانے کے تقاضے انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے۔ اس شکل میں دشواری یہ ہوتی ہے کہ یہ

نظام بیک جست اپنی منزہ صورت میں سامنے نہیں آ سکتا۔ ابتداءً بڑی دھندلی سی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور پھر تجرباتی طریق سے بتدریج اپنی منزہ شکل تک پہنچتا ہے۔

ہم (وارثین کتاب اللہ) نے اپنا فریضہ ادا نہ کیا، تو اس انقلاب نے دوسری شکل اختیار کر لی عصرِ حاضر میں اس کی پہلی نمود مارکس کی فکر میں سامنے آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے سینے میں قلبِ حساس تھا، جو مظلوم و مقہور انسانوں کی حرماں نصیبی پر ـــــ جن پر بالا دست انسانوں کی چیرہ دستیوں نے رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے ـــــ خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دکھ دور ہو جائیں۔ وحی کی حقیقی روشنی (قرآنی تعلیم) اس کے سامنے نہیں تھی۔ اس کے سامنے عیسائیت تھی جو لفظاً انسانیت کے دکھوں پر آنسو بہانے کی مدعی ہونے کے باوجود، عملاً اس نقشہ کو قائم رکھنے کا موجب تھی جس سے یہ تمام دکھ وجود میں آتے ہیں ـــ جب آپ خدا پرستی کے لئے دنیا کو تیاگ دینے یا اسے قابلِ نفرت سمجھنے کو اوّلین شرط قرار دے دیں۔ اور مظلوموں کے دکھ دور کرنے کے لئے عدل کے بجائے رحم کی بھیک مانگیں، تو مستبد قوتیں دندناتی پھریں گی۔ انہیں ظلم و ستم سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مارکس نے اس حقیقتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان چیرہ دستیوں کا بنیادی سبب مذہب کا تصور ہے۔ اس لئے اس نے مذہب کو انسانیت کا اوّلین دشمن قرار دیدیا۔ اگر اس کے سامنے "مذہب" کے بجائے "دین" (قرآن کریم) ہوتا تو وہ کبھی اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔

روس میں بھی اسی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ اس لئے لینن بھی خدا کے متعلق، اسی نتیجہ پر پہنچا، کہ اس کا تصور مفاد پرستوں کا پیدا کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خدا پر ایمان نہ رہے تو انسانی ذات، وحی، حیاتِ آخرت پر ایمان خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

چین میں مذہب کے سلسلہ میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ وہاں ایک چھوڑ، تین تین قدیم مذاہب مروج تھے۔ اور تینوں کے تینوں توہم پرستی کے مظاہر، کنفیوشس ازم کی تعلیم خالصتہً اسلاف پرستی تھی جس میں جمود و تقلید سب سے بڑی نیکی اور تغیر و اصلاح کا تصور سب سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے (بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں مذہبی پیشوائیت تقلید کو عین دین بنا کر پیش کرتی، اور ہر تغیر اور جدت کو جہنم کے عذاب کا مستوجب قرار دیتی ہے) طاؤازم گیان دھیان میں مست رہ کر دنیا تیاگ دینے کی تعلیم دیتا تھا۔ بدھ مت اس سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس میں منتہائے زندگی نروان حاصل کرنا ہے جس سے مراد اپنے آپ کو فاطبتہً فنا کر دینا ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے سامنے یہ مذاہب تھے۔ اس لئے اس کا ردِ عمل ظاہر ہے۔ اس نے فکری طور پر ہیگل، بلکہ مارکس سے بھی اختلاف

کیا لیکن مذہب کیخلاف اس کی شدت ان سے بھی زیادہ بڑھ گئی ـــــ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اتنا بڑا انقلابی ذہن، جمود و تعطل کے اس جذام کو کیسے گوارا کر لیتا؟ ـــ لیکن چونکہ دین اس کے سامنے بھی نہیں تھا، اس لئے اس نے بھی اپنے فلسفہ کی بنیاد اپنے قیاسات ہی پر رکھی۔ وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

یہ ہے وہ فلسفہ جس کا اجمالی تعارف ہم نے شروع میں کرایا تھا اور جس کی بنیادوں پر، وہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی بنیادوں پر یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب چین میں السابقون الاولون (PIONEERS) کی موجودہ نسل ختم ہو جائے گی تو پھر (آئندہ نسل کے لئے) اتنی بڑی قربانیوں کے لئے کوئی جذبہ محرکہ نہیں رہے گا۔ اور چینی انقلاب بھی اسی تحریف (REVISIONISM) پر مجبور ہو جائے گا جس کا طعنہ وہ اس وقت روس کو دے رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے روس اور اس کے بعد چین کی ان انقلابی جماعتوں نے کائناتی قانون کی تائید کے لئے ہاتھ اٹھا کر اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ لیکن چونکہ انکے انقلاب کی اساس و بنیاد محکم نہیں، اس لئے یہ انقلاب ایک ہنگامی حادثہ بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے بعد اگر کائناتی قانون نے اپنے حساب سے "ایک دن" کی بھی مزید "تاریخ ڈال دی"، تو انسانیت کو صدیوں تک پھر سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس وقت، اس معاشی انقلاب کو قرآن کی اساسِ محکم مل جائے تو پھر نظامِ سرمایہ داری سر نہیں اٹھا سکے گا۔ اور جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لے گا۔ اقبال نے، نیٹشے کے فکر کی بلندی اور اسکی بنیاد کی پستی کو دیکھکر کہا تھا کہ

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس "مجذوبِ فرنگی" سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس "سالکِ چینی" کو مقامِ کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے۔ یہ اس لئے کہ مقامِ کبریا کے راستے میں جو خاردار جھاڑیاں دامنگیر ہوتی ہیں، چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے ـــ وہاں بادشاہی، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وہ خاردار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو خدا تک پہنچنے نہیں دیتیں ـــ یہ وہ حصہ لا ہے جسے طے کئے بغیر انسان الا اللہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد، دین کی منزلِ الا اللہ کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت اسے اس مقام

کی نشان دہی کر دی جائے اور وہ اس راستے کو اختیار کر لے، تو صرف چین ہی نہیں، عالمگیر انسانیت اُس جہنم سے بچ سکتی ہے جس میں اُسے بصورتِ دیگر، نہ معلوم کتنے عرصہ تک اور مبتلائے مصائب رہنا پڑے اور اس سے نکلنے کے لئے خدا جانے اسے کتنی خون کی ندیاں پینی، اور آگ کے دریا عبور کرنے پڑیں ۔۔

مسلم ممالک میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا کہ وہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عملاً متشکل کر دے۔ یہ ممالک ابھی حصہ لَا ہی سے نہیں نکلے، حصہ اِلَّا تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اس سے "اسلام اس ٹھپے کو مٹا سکے گا جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر دیا تھا"۔ لیکن یہاں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت اپنا تسلط جما رہی ہے اسکے پیشِ نظر یہاں دین کے تمکن کے امکانات بہت پیچھے جا پڑے ہیں۔ یاد رکھئے! مذہبی پیشوائیت کا اقتدار نظامِ سرمایہ داری کے ملنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کے بڑھنے سے دوسری بڑھتی ہے اور ایک کے گھٹنے سے دوسری گھٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں دین کے انقلابی پروگرام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ خواہ وہ وحی کی راہ نمائی میں وجود کوشش ہو، اور خواہ زمانے کے تقاضوں سے ۔۔۔ یہ وجہ ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآن کا پیغام کسی طرح ماؤزے تنگ تک پہنچ جائے اور وہ اسے سمجھنے پر آمادہ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے نوعِ انسان کی تقدیر بدل جائے اور اقبال نے حکیم سنائی کا اس مصرعہ کے اندر چھپی ہوئی جس، "قیامت پیش از قیامت" کا خواب دیکھا تھا جنت سے نکلا ہوا آدم، اس خواب کی تعبیر کو اپنی آنکھوں کے سامنے متشکل دیکھ لے ۔۔ یہ خواب، اس نظم کے ایک بند میں مرقوم ہے جسے علامہ نے حکیم سنائی کے مزار کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا تھا۔ یعنی

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا
نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی!
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ!
یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ
حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا!

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
"گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!" (یہ مقولہ حکیم سنائی کا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تاریخ نے ہمیں ایک عجیب مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جنکا نظام سرمایہ دارانہ ہے لیکن وہ (عیسائی یا یہودی ہونے کی جہت سے) اپنے آپ کو خدا پرست کہتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی خدا پرستی کو خدا پر ایمان قرار ہی نہیں دیتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن کے تراشیدہ (یا اپنے مذہب کے پیش کردہ) خدا کے تصور کے مطابق خدا کو مانیں۔ خدا پر ایمان کے یہ معنی ہیں کہ آپ خدا کے اس تصور پر ایمان رکھیں جو تصور اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے۔ اور وہ تصور قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم نے اہل کتاب سے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا پر ایمان لائیں۔ لہٰذا، قرآنی نقطۂ نگاہ سے، نہ اہل مغرب خدا پرست ہیں اور نہ ہی ان کا نظام، قرآنی نظام کے مماثل ہے۔ بلکہ وہ اس کی ضد ہے۔ ان کی طرف سے یہ نعرہ کہ:

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور اشتراکیت کے خدا فراموش نظام کے خلاف متحدہ محاذ بناؤ"

محض ایک سیاسی نعرہ ہے جو مسلم اقوام کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

دوسری طرف کمیونزم ہے جس کا نظام تو قرآنی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کا فلسفۂ حیات قرآنی فلسفۂ زندگی کی نقیض ہے۔ اس لئے وہ بھی، قرآنی نقطۂ نگاہ سے، مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ جس طرح قرآن اپنے نظام کو فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی اپنے معاشی نظام کو اپنے فلسفۂ زندگی سے جدا نہیں کرتی۔ کمیونسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام کو ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔ یہ وجہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ نہ ایک کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ایک مسلمان کمیونسٹ۔

تیسری طرف ہم مسلمان ہیں جن کے ہاں قرآنِ کریم کے الفاظ تو بے شک محفوظ ہیں لیکن عملاً نہ ہمارا نظام قرآنی ہے، نہ فلسفۂ زندگی قرآنی۔ ہم بھی درحقیقت اسی مقام پر ہیں جس مقام پر مغرب کے اہل کتاب ہیں ــــ اس فرق کے ساتھ کہ ان کے پاس خدا کی راہ نمائی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اور ہمارے پاس وہ (غلافوں میں لپٹی ہوئی) محفوظ رکھی ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے جو کہا تھا کہ اگر اشتراکیت کے ساتھ خدا کو شامل کر لیا جائے تو وہ اسلام کے مماثل ہو جاتی ہے، تو یہ فارمولا کاروانِ انسانیت کے لئے منزلِ مقصود کی

صحیح نشان دہی کرتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے مسلم ممالک ابھی آمادہ نہیں۔ وہ اس تصورِ حیات سے ہنوز بہت دور ہیں۔ لیکن دینِ خداوندی پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں کہ وہ اسے چلانا چاہے تو وہ چل سکے اور اگر وہ اسے قصۂ پارینہ بنا بیٹھے تو دین بے بس و مجبور بیٹھا اس کا منہ تکتا رہے۔ یہ تمام نوعِ انسانی کی مشترکہ وراثت ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی اسے اپنانا چاہے، دین اسی کا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مخاطب قوم سے کہتا ہے کہ دین کا نقشہ تمہارے سامنے آچکا ہے — فَإِنْ تَوَلَّوْا ..... يَسْتَخْلِفْ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۔ اگر تم اسے اپنانا چاہتے ہو تو ہو المراد۔ لیکن اگر تم اس سے روگردانی کرنا چاہتے ہو تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا، جو اسے اپنا لیگی — وَلَا تَضُرُّوْنَهُ شَيْئًا ۔ (۱۱/۵۷) اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ دین ایک خاص فلسفۂ حیات کے مطابق نظامِ زندگی تشکیل کرنے کا نام ہے۔ جو قوم بھی ایسا کرنا چاہے، دین لپک کر اسے سینے سے لگا لیگا

اٹھا لے جو بڑھا کر ہاتھ میں بادہ اسی کا ہے

لہٰذا، یہ حالاتِ موجودہ کشاد کی راہ ایک ہی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اشتراکی ذہن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جس فلسفہ پر وہ اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے اس کی بنیادیں اس عمارت کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتیں، یہ عمارت قرآنی فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے، تو امید کیجا سکتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے۔ اس وقت اشتراکی ذہن کا سب سے بڑا نمائندہ ماؤزے تنگ ہے۔ چین کے ستر کروڑ نفوس اس کی فکر کی پرستش کرتے ہیں اور چین سے باہر کس قدر اذہان اس فکر سے بالواسطہ متاثر ہیں، اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ پوزیشن دنیا میں اس وقت کسی اور مفکر کو حاصل نہیں اور نہ ہی عملی اعتبار سے اس وقت کوئی دوسرا انسان ایسا نظر آتا ہے۔ جو اسلام جیسے عالمگیر انقلاب کو اپنے ہاں عملاً نافذ کرنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس ایک ذہن کی فکر میں قرآنی تبدیلی آجائے تو عالمِ انسانیت میں اس سے بڑا انقلاب اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس سے فی الواقعہ دنیا میں قیامت سے پہلے وہ قیامت برپا ہو سکتی ہے جس کا تصور اقبالؒ نے پیش کیا تھا اور اس نے "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے" کی جو تاریخی حقیقت بیان کی تھی، چہ عجب کہ اس کی تائید میں ایک اور شہادت دنیا کے سامنے آجائے۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ ہمارے ہاں (ہر کمزور قوم کی طرح) یہ ذہنیت چلی آرہی ہے کہ دنیا میں جونہی کسی بڑے آدمی نے غلبہ و اقتدار حاصل کیا تو اس کے متعلق یا تو ہم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "وہ اندر سے مسلمان ہی ہے" اور یا اس کے مسلمان ہونے کی دعائیں مانگنے لگ گئے۔ لیکن میرے اس خیال کی محرک یہ ذہنیت نہیں — میں اس نتیجہ پر جن دلائل و وجوہات کی بنا پر پہنچا ہوں، انہیں میں نے تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔

اگر اربابِ فکر و نظر کو اس تجزیہ حالات میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کی نشاندہی کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔ میری قرآنی بصیرت نے بہرحال مجھے اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے اور وہی مجھے اس پر بھی مجبور کر رہی ہے کہ میں اسے اربابِ علم و بصیرت کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کر دوں کیونکہ کتمانِ حقیقت قرآن کی رُو سے انسانیت کے خلاف جرمِ عظیم ہے۔

آخر میں میں اتنا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سابقہ صفحات میں ماؤزے تنگ کی فکر پر جو تنقید کی گئی ہے تو اس سے اسکی تنقیص مقصود نہیں۔ قرآنِ کریم عقلِ انسانی کا مقام بہت بلند قرار دیتا ہے۔ اور اس سے کام لینے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص بھی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کے مسائل سلجھانے کی کوشش کرے گا، وہ ہمارے نزدیک مستحق تحسین و ستائش ہے۔ لیکن (وہ کہتا یہ ہے کہ) جس طرح (مثلاً) انسانی نگاہ کی ایک حد ہے جس سے آگے کی چیز اسے نظر نہیں آسکتی، اسی طرح عقلِ انسانی کی بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا نہیں سکتی۔ وحی کی راہنمائی ایک دوربین ہے جس سے عقلِ انسانی کی آنکھ اپنی عام حد سے بہت آگے کی چیزیں دیکھ سکتی ہے۔ ماؤزے تنگ (یا دیگر مفکرین) کی حدِ نگاہ یقیناً عام انسانوں سے زیادہ وسیع ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اسے وحی کی راہ نمائی کی دوربین مل جائے تاکہ وہ راستے کے ان مقامات کو یقین کی آنکھ سے دیکھ سکے جسے اس وقت وہ محض قیاس کی لکڑی سے ٹٹولتا ہے اسلئے غلطی کھا جاتا ہے۔ ہم اگر اس وقت اس سے زیادہ دور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں تو اس میں ہماری آنکھ کا کوئی کمال نہیں، یہ اس دوربین کی خوبی ہے۔ یہ دوربین اگر اس مفکر کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ ہم سے بہت زیادہ آگے دیکھ سکے گا۔ اس لئے خود بھی راستے کے خطرات سے محفوظ رہیگا اور کاروانِ انسانیت کو بھی بحفاظت اس کی منزل تک لے جا سکے گا ۔۔۔۔۔ یہ ہے میری آرزو کا مقصود، اور میری سعی و کاوش کا مطلوب۔

یارب! ایں آرزوئے من چہ خوش است!

اس مقالہ کو الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے

بزمیں اور دیگر احباب ۔۔۔۔۔ اپنی اپنی مانگ سے بہت جلد مطلع کریں۔

ناظم ۔ ادارہ طلوعِ اسلام

بَابُ المُرَاسَلات

بیویوں کو مارنا

ایک صاحب نے ایک طویل خط لکھا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ سورۃ نساء میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اپنی بیویوں کی طرف سے سرکشی کا خوف ہو تو تم انہیں سمجھاؤ۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو انہیں خوابگاہوں سے الگ کردو۔ اور اگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو تو ـــــ وَاضْرِبُوْهُنَّ ـــــ (۳۴/۴) تم انہیں مارو۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے خاوند کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایسی صورت میں بیوی کو مار بھی سکتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہ حق عدالت کو حاصل ہے۔ وہ اگر عورت کو مجرم پائے تو اسے بدنی سزا دے سکتی ہے انفرادی طور پر ایک کو حق حاصل نہیں کہ وہ اٹھ کر بیوی کو مارنا شروع کردے۔ یہ پرویز صاحب کی اپنی رائے ہے جو قرآن کریم کے حکم کے خلاف ہے۔

جواب :-

محترم مستفسر صاحب کا یہ اعتراض قرآن کریم کے اسلوب و انداز سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد جرائم کی سزا تجویز کی ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا کہ یہ سزا عدالت کی طرف سے دی جا سکتی ہے۔ قرآن میں عدالت یا نظامِ عدل کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مثلاً سارق (چور) کی سزا کے سلسلہ میں فقط اتنا کہا ہے کہ ـــــ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا ـــــ (۳۸/۵) چور، عورت ہو یا مرد، ان کا قطع ید کردو۔ یا زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا ہے ـــــ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ـ (۲/۲۴) ـــــ زانی عورت ہو یا مرد، انہیں سو کوڑے مارو۔ بہتان تراشی کی سزا کے سلسلہ میں بھی ـ فَاجْلِدُوْهُمْ ـ (۴/۲۴) کہا ہے : یعنی انہیں اسّی کوڑے لگاؤ۔ لواطت یا سحاقت کے ضمن میں کہا ہے ـــــ فَاٰذُوْهُمَا ـ (۱۶/۴) ـــــ انہیں مناسب سزا دو۔ جرم فحاشی کے سلسلہ میں کہا ہے ـــــ فَاَمْسِكُوْهُنَّ ـ (۱۵/۴) ـــــ انہیں پابندِ مسکن کردو۔ آپ نے دیکھا کہ ان احکام میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ ملزم کو عدالت میں پیش کرو۔ عدالت فیصلہ کرے کہ وہ مجرم ہے یا نہیں اور جرم ثابت ہونے پر عدالت ہی اسے سزا دے جس کا نفاذ حکومت کی طرف سے ہو۔ اب سوچئے کہ اگر ان احکام

کے الفاظ کے پیشِ نظر یہ سمجھ لیا جاتے کہ ان سزاؤں کا حق ہر ایک کو دیا گیا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اَلسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا ۔ کا یہ مطلب ہے کہ جس شخص کو تم چوری کرتے دیکھو اس کا ہاتھ کاٹ دیا کرو؟ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ عدل کا اصول بیان کرتا ہے۔ نظامِ عدل کو امت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔ عام جرائم تو ایک طرف، وہ حکومت کے خلاف بغاوت جیسے سنگین جرم کے سلسلہ میں بھی عدالت کا ذکر نہیں کرتا، صرف باغیوں کی سزا کا ذکر کرتا ہے لیکن عدالت کا ذکر نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔

کسی شخص کا کسی کو مارنا پیٹنا ۔۔۔ خواہ وہ جرم کی پاداش ہی میں کیوں نہ ہو ۔۔۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا ہے۔ اگر آپ (مثلاً) کسی جیب تراش کو پکڑ کر پیٹنے لگ جاتے ہیں اور اس سے اس کا دانت ٹوٹ جاتا ہے، تو اسے اگر جیب تراشی کے جرم کی سزا ملے گی تو آپ کو اس ضربِ خفیف یا شدید کے جرم کے ارتکاب کی سزا ملے گی. اس لئے کہ آپ نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا آپ کا کام تھا کہ اس جیب تراش کو حوالۂ پولیس کرتے۔

جب عام قانون یہ ہے تو بیویاں بیچاری ہی ایسی جنسِ مظلوم ہیں کہ خاوندوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں اور انہیں مارنا پیٹنا شروع کر دیں۔ لہٰذا جس طرح ۔ فَاقْطَعُوْٓا یا فَاجْلِدُوْا کے معنی یہ نہیں کہ تم ان کے ہاتھ کاٹ دو یا انہیں کوڑے مارنے لگ جاؤ۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ عدالت انہیں اس قسم کی سزا دے، اسی طرح سورۃ نساء میں وَاضْرِبُوْهُنَّ. کے معنی بھی یہ نہیں کہ تم انہیں خود ہی مارنے لگ جاؤ۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ عدالتِ مجاز انہیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میاں بیوی کے تنازعہ کو عدالت میں لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری پرائیویٹ زندگی کی تشہیر ہو جائے ۔۔ اسے کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں اول تو یہ گزارش ہے کہ جب قرآن کریم متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ عدالت یا حکم کے ذریعے کرانے کا حکم دیتا ہے تو اس میں پرائیویٹ اور پبلک لائف کا کیا سوال ہے۔ میاں بیوی کے اختلافی معاملات کے سلسلہ میں ثالث مقرر کرنے کا حکم اسی سورۃ نساء میں ہے (۳۵؍۴)۔ اس میں تو پھر بھی شاید زیادہ پرائیویٹ باتیں سامنے نہ آئیں۔ وہ بیوی کے خلاف سنگین تہمت کے سلسلہ میں لعان"

تجویز کرتا ہے (۴/۳۵) — جو بہر حال عدالت ہی میں ہوگا۔ اس میں واضح الفاظ میں الزام ثابت کرنے یا اس سے برتیت کی کوشش کی جائیگی۔ پرائیویٹ زندگی کی اس سے بڑھ کر تشہیر اور کیا ہوگی۔

اس اعتراض کا جذبۂ محرکہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے سامنے موجودہ حکام یا بی۔ ڈی کے چیئرمین ہوتے ہیں جن کے سامنے ہماری پرائیویٹ زندگی کا پیش ہونا موجب تشہیر ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم جن مومنین کو حکم یا حاکم تجویز کرتا ہے انکی صورت میں اس قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ وہ تو افرادِ ملت کے رازوں کے امین اور فریقین کے مشفق بزرگ ہوتے ہیں ؁

رشتہ کی ضرورت

ایک پنجابی ریٹائرڈ اسسٹنٹ انجینئر کی سلیقہ شعار، بلند خیال (عمر ۲۰ سال) ایف ۔ اے کی طالبہ ناکتخدا لڑکی کے لئے تعلیم یافتہ سلیم الطبع۔ قرآنی فکر کے شائق، برسرِ روزگار لڑکے (عمر ۲۵۔ ۳۰ سال کے درمیان) کے رشتے کی ضرورت ہے ؁

خط و کتابت :- (د م) معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور !

ہر طرح کی واٹر پروفنگ کیلئے ہر جگہ ملتا ہے

"سیمٹو"

CEMTO

"سیمنٹ کو واٹر پروف بنانیوالا آمیزشی پوڈر"

تیار کنندگان

پاکستان واٹر پروفنگ کمپنی۔ کراچی۔

لاہور آفس ۲۔ میکلوڈ روڈ ۔ جی پی او بکس نمبر ۱۳۲۱ ۔ لاہور ۔ فون ۔ ۶۶۰۵۴

رابطۂ باہمی

اجتماع نمائندگان

طلوعِ اسلام کی سابقہ کنونشن میں طے پایا تھا کہ آئندہ کنونشن تو اکتوبر/نومبر ۱۹۶۷ء میں منعقد کیجائے لیکن اس دوران میں، نمائندگان کے اجتماعات کا انعقاد ہوتا ہے۔ تاکہ تحریک کے فروغ کے سلسلہ میں جو جدید اسکیم عمل میں لائی گئی تھی، اس کا جائزہ لیا جائے اور اس میں مزید تحرک پیدا کرنے کے ذرائع و وسائل پر غور کیا جائے۔ اس فیصلہ کیمطابق، ۱۰ ، ۱۱ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ادارہ کے مرکز ۲۵/بی گلبرگ لاہور میں بزموں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا۔ اس میں کراچی، راولپنڈی، کوئٹہ، لائل پور، سرگودھا، میانوالی، ڈسکہ، بورے والا، لیہ، جلاجیم، سید حسن، سکھو چک، کنجاہ، ھکے شمالی (سرگودھا)، پنڈ دادن خان، چنیوٹ، ملتان، مردان، گجرات، جہلم، سیالکوٹ، کمالیہ سے نمائندگان اور مخصوص متفقین شریکِ محفل ہوئے۔ ایسی شدید سردی کے موسم میں، اس قدر دور دراز مقامات سے ان احباب کی شرکت، ان کے ذوقِ قرآنی کی آئینہ دار تھی۔ بعض احباب ۹ دسمبر (جمعہ کی شب) کو تشریف لے آئے اور دیگر احباب کی آمد ہفتہ کی صبح سے شروع ہو کر دوپہر تک تکمیل کو پہنچ گئی۔ پہلا اجلاس، ہفتے کے روز، کھانے کے بعد منعقد ہوا جس میں گزشتہ آٹھ ماہ کی رفتارِ تحریک کا جائزہ لیا گیا اور مقامِ مسرت ہے کہ اس کا نتیجہ جملہ شرکاء کے لئے وجہ اطمینان ثابت ہوا۔ عشاء کی نماز کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا اور نصف شب تک جاری رہا۔ اس میں آئندہ کے پروگرام کے سلسلہ میں آزادانہ گفتگو ہوتی اور اس کے استحکام کے لئے ضروری تجاویز اختیار کی گئیں۔ صبح، اتوار کے درسِ قرآنِ کریم میں شرکت کے بعد، الوداعی اجلاس ہوا جس میں شب کی تجاویز کو قراردادوں کی شکل دی گئی اور ہر قرارداد بلا اختلافِ رائے منظور کی گئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد احباب رخصت ہوئے۔

کس قدر وجۂ نشاطِ روح ہوتے ہیں ایسے اجتماعات جن میں، احباب، کسی ذاتی مفاد کو سامنے رکھے بغیر، خالصۃً للّٰہیت کے جذبات سے سرشار، قرآنی وجد و شوق کی کیف باریوں میں ڈوبے ہوئے، ایک دوسرے سے گلے ملیں۔ اللہ تعالیٰ اس حسین و جمیل نظم کو ابدیت درکنار کرے۔

بیادِ اسلم علیہ الرحمۃ

فہمِ قرآن

علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) اس دور میں کاروانِ فکرِ قرآنی کے سالاروں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز، نورِ قرآنی کے عام کرنے میں صرف کردی۔ ۲۸ دسمبر کو ان کی گیارھویں برسی تھی (ان کی وفات جامعہ ملیہ نئی دہلی میں ۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہوئی تھی) شمعِ قرآنی کے اس درخشندہ پروانہ کی یاد منانے کا اس سے بہتر طریق اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم ان کا ایک مقالہ جسے انہوں نے عنوان بالا سے، ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کے لئے تحریر فرمایا تھا، زینتِ اوراقِ طلوعِ اسلام کریں ——— خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

قرآن کریم کامل اور مکمل کتاب ہے اور اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "نورِ مبین" رکھا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔ (۴/۱۷۴)

اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اتارا۔

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے کہ وہ واضح، کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنی تشریح آپ ہے۔ اس کی تلاش کے لئے کسی روشنی کی ضرورت نہیں، جس طرح آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان جملہ حقائق کی جن سے انسان کو ہدایت ملے اور قدیم آسمانی کتابوں کی جملہ تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَ

بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۔ (۱۶/۸۹)

اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (۱۲/۱۱۱)

یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں' ہدایت اور رحمت ہے۔

مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۱۰/۳۷)

یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو بنا لے بلکہ یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

آیتِ بالا میں الکتاب سے مراد علم الٰہی ہے جس کو قرآن میں جابجا اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ذٰلِكَ فِىْ كِتٰبٍ ۔ (۲۲/۷۰)

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ان سب چیزوں کا علم رکھتا ہے جو آسمان و زمین میں ہیں، بیشک وہ لکھی ہوئی ہیں۔

اس علم کو کتابِ مبین فرمایا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔ (۶/۵۹)

وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو کچھ خشک و تر ہے وہ سب کتاب مبین میں ہے۔

اسی کتاب مبین کو اللہ نے عربی قرآن بنایا۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (۴۳/۲)

اور کتاب مبین شہادت دیتی ہے کہ ہم نے اس کو عربی بنایا تاکہ تم سمجھ سکو۔

کتابِ مبین صحیفۂ فطرت ہے جو فعلِ الٰہی ہے۔ اب صحیفۂ فطرت فعل الٰہی اور کتاب مبین علم الٰہی ہے۔ اور

قرآن کریم قولِ الٰہی۔ ان تینوں کی حقیقت کا متحد ہونا واضح ہوگیا۔ جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور انسانی نسلیں ان کو کبھی ختم نہیں کر سکتیں۔ اسی صلاحیت کی وجہ سے قرآن ہمیشہ کے لئے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

مزید توضیح کے لئے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں اسقدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مثلاً زمین، دریا، پہاڑ اور جنگل کو دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطرتی چیزیں ہیں اور اگر زمین پر کوئی عمارت یا پہاڑ میں کوئی بت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کسی مشین کا ٹکڑا نظر آئے تو ہر شخص بلا استثناء کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔ درخت پر سے گرا ہوا ایک پتا، گھاس میں سے جھڑا ہوا ایک تنکا۔ چیونٹی کا ٹوٹا ہوا ایک پاؤں، بھیڑ کا گرا ہوا ایک بال ۔ اگر سارے عالم کے ماہر کاردان کاریگر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے یہی فرق اللہ کے کلام اور انسانی اقوال میں ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ (۱۷/۸۸)

کہہ دے اگر سارے جن و انس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنا لائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق چونکہ عقلی چیزیں ہیں، اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا، بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی قرآن کا اعجاز ہے جو اہلِ بصیرت پر نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے آیاتِ الٰہی کا موازنہ قولِ انسانی کے ساتھ کر کے اس کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے، وہ حقیقت میں اعجازِ قرآن کے سمجھنے سے بہت دور رہے۔

دوسرا فرق مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی معین حد نہیں ہوتی بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں۔ اسی قدر ان کے افعال و خواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے کہ ان کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جن کو پہلے سے مدنظر رکھ کر وہ بنائی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول، ایک زبان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر زمان، ہر ماحول اور ہر مکان کیلئے ہے انسان کا اشیاء فطرت کے متعلق جس قدر علم بڑھتا جائے گا، اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے اور قرآن بھی فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھکنے والا

نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہدِ صحابہؓ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا، اور اب ہم کو انہیں کی فہم پر قناعت کرنا چاہیئے، وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا علم قرآن دیگر علماء قرآن سے اس لحاظ سے افضل ہے کہ انہوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا اور جو کچھ سمجھا یا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا۔ اس کی حرف بحرف تعمیل کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے، بلکہ عملی بھی ہے۔ اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے صحابہؓ کا درجہ عملی لحاظ سے اسقدر افضل ہوا کہ ساری اُمت مل کر بھی ان کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں الجھانا چاہتے ہیں جو صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی ایک ماحول کی کتاب نہیں ہے۔ اگر کسی ایک زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لیا گیا تو بس ختم ہو گیا اور آئندہ کے لئے کوئی نصاب نہیں رہا۔ لیکن وہ قیامت تک کے لئے نصاب ہے۔ اور ہر زمانہ میں نئی روشنی ہدایت کے لئے اس سے نکالی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ ان پر قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کی تشریح کا مدار رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوتی تھیں، لوگ ان کے شانِ نزول سے واقف تھے، اس لئے انہوں نے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا؛ دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شانِ نزول، موقع نزول یا واقعۂ نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ بالاتر ہیں۔

ہماری تمام تفسیریں آغازِ عہد سے اب تک یعنی امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہٗ تک اسی قدامت پرستی کے نظریہ کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے آج تک ایک ہی ہے یعنی وہ سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کی تو ضرور تشریح ہو جاتی ہے مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آتے، کیونکہ وہ مسلسل نہیں بیان کئے گئے ہیں، بلکہ مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے قرآن فہمی کے لئے یہ تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا جو مفید حصہ ہو سکتا ہے، تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں جمع کر دیا ہے۔ بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی شرح آپ ہے۔ اس کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ (۷۵/۱۹) پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

آیاتِ قرآنی بیشتر محکم ہیں یعنے ان کے معنے قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات، صفات، جنت، دوزخ اور میزان عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قرآن نے بیان کیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔

محکم آیات جو اُم الکتاب اور اصل کتاب کہی گئی ہیں ان کی تفصیلات اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۔ (۱۱/۱)

(یہ مکمل کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں۔ پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۔ (۷/۵۲)

ہم ان کے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں جسکی تفصیل ہم نے علم کیساتھ کی ہے۔

اسی لئے قرآن کو کتاب مفصل کہا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ (۶/۱۱۴)

اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ۔

یہ تفصیل اہل علم اور اہل فہم کے لئے ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ (۷/۱۷)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۔ (۶/۹۸)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔

جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا، اسی قدر وہ قرآنی تعلیمات کی تفصیلات زیادہ سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر معانی سمجھنے میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جس طرح کہ اشیاء فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے لیکن مزید غور و فکر سے رفتہ رفتہ آخرکار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر تبدیل الفاظ و عبارات جا بجا اُلٹ پھیر کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، ان میں ان کی تشریح مضمر ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ـــ (۶/۱۰۵)

اور اسی طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ وہ کہدیں کہ تو نے پڑھ کر سنا دیا، اور تاکہ ہم اصل علم کے لئے اس (قرآن) کی تشریح کر دیں۔

الغرض قرآن کریم ایسی جامع اور کامل کتاب ہے کہ اس کی آیات، الفاظ اور تعلیمات کی تشریح، توضیح اور تفصیل سب اس کے اندر ہے اور سمجھنے کے قواعد اور ضوابط بھی بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

۱۔ قرآن کریم، مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطہ ہدایت ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اسلئے حضورؐ کی سیرت کے نقوش قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

۲۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں آتی ہیں، ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ جو حکومت، قرآن کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی ـــ اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت، یا اسلامی مملکت کہا جائے گا۔

۴۔ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ـــ خوراک، مکان، لباس، علاج وغیرہ ـــ بہم پہنچانے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا عمل) تھیاکریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قول فیصل سمجھا جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

۶۔ اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار، جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

۷۔ طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے اسلامی نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے، نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے کیونکہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں یہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اس کا ساتھ دیجئے۔

(ناظم)

سرمایہ لگانے کا بے مثال موقع

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ اب آپ کو چھ سے زیادہ نفع اور بونس دیں گے۔ ٹیکس کی چھوٹ اس کے علاوہ ہے۔ اگر آپ یہ سرٹیفکیٹ پانچ برس تک رکھیں تو نفع ۶ فیصد کا اگر مزید پانچ برس اور رکھیں تو نفع ۷ فیصد ہو جائے گا یعنی ۶ فیصد نفع اور مزید ۲ فیصد بونس۔

صرف دس برس میں آپ کے ۱۰۰ روپے ۱۸۰ روپے بن جائیں گے۔ یہ نفع یقیناً بینک سے زیادہ ہے۔ نفع اور بونس دونوں پر ٹیکس کی مکمل چھوٹ ہے آپ کی لگائی ہوئی ابتدائی رقم پر بھی انکم ٹیکس کی رعایت ملتی ہے یعنی اتنی رقم آپ کی آمدنی میں سے منہا کر کے ٹیکس تشخیص کیا جاتا ہے۔

انفرادی طور پر ۲۵ ہزار روپے تک کے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ مشترکہ طور پر ۵۰ ہزار روپے تک۔ ادارے اس سے زیادہ رقم بھی لگا سکتے ہیں اور ضابطے کے مطابق نامزدگیوں کی بھی اجازت ہے

۵ روپے، ۱۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۵۰۰ روپے، ۱۰۰۰ روپے اور ۵۰۰۰ روپے کی مالیتوں میں 'ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ' اسٹیٹ بینک آف پاکستان منظور شدہ بینکوں اور ڈاک خانوں سے خریدے جا سکتے ہیں

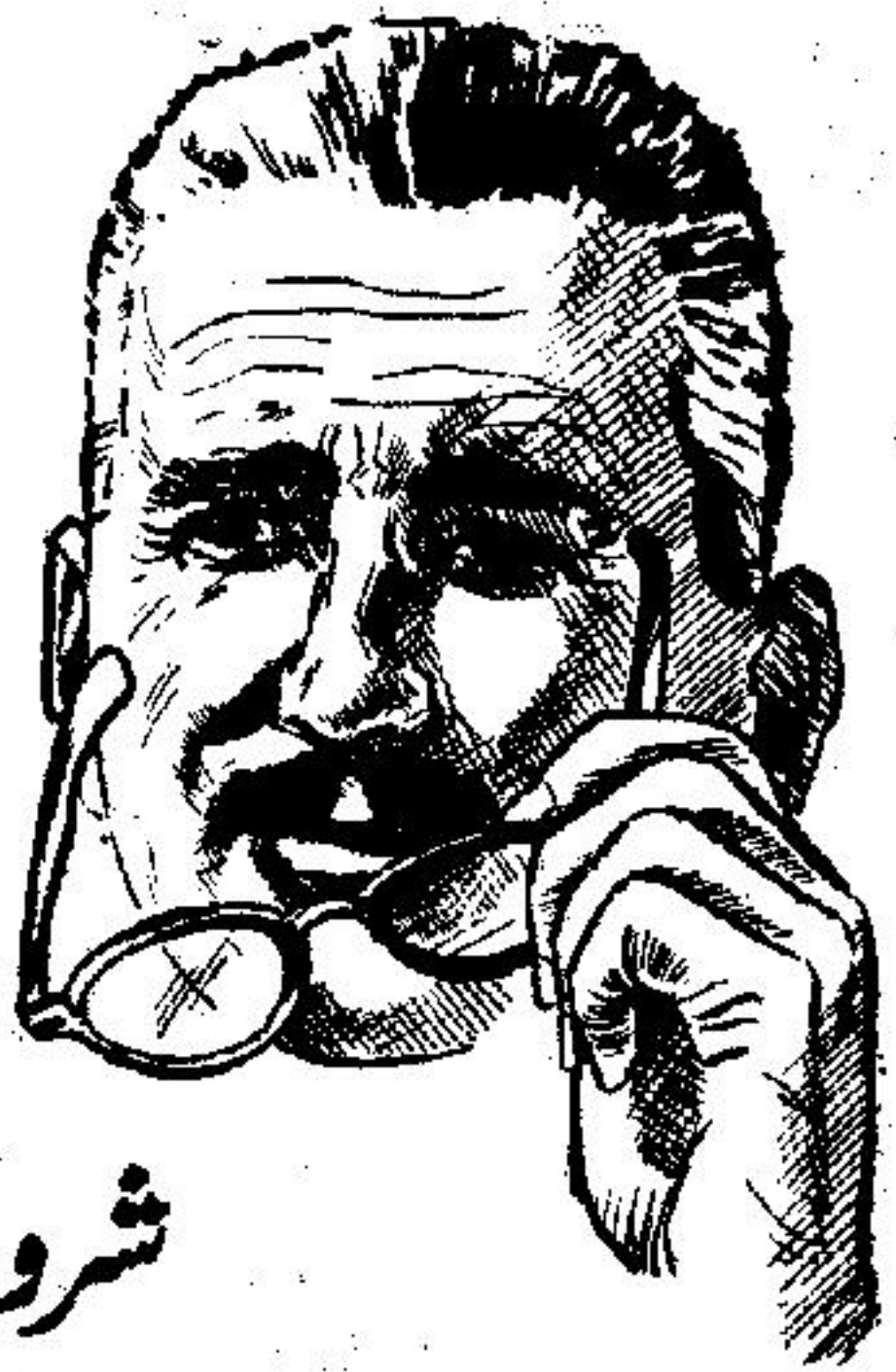

زندگی دراصل ۵۵ سال کے بعد شروع ہوتی ہے

.... جب آپ ملازمت سے فارغ ہو جائیں۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ بیکار رہیں۔ دراصل یہی وہ وقت ہے جب آپ کے زندگی بھر کے وہ خواب پورے ہو سکتے ہیں جو روزمرہ کی مصروفیات کی وجہ سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ اب آپ اپنے دلپسند مشغلوں۔ سیر و سیاحت اور غور و فکر میں اپنا وقت صرف کر سکتے ہیں۔ آپ کے یہ خواب پوسٹل لائف پیمے ہی کے ذریعے پورے ہو سکتے ہیں۔ پوسٹل لائف انشورنس کی پریمیم کی شرح سب سے کم اور منافع زیادہ ہے۔ پریمیم کی شرح میں بغیر کسی اضافہ کے ماہانہ قسطوں کی سہولت میسر ہے۔ اور تمام ادائیگیاں بلا تاخیر کی جاتی ہیں۔

پوسٹل لائف انشورنس

ملک میں بیمہ کا سب سے بڑا ادارہ!

وہ کتابیں جن سے اسلام کا حقیقی تصور سامنے آتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری بھی ہے اور انداز میں اس کی تفسیر بھی۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت - پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیبی ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔

جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گریدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت، بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم - ملائکہ - ابلیس - شیطان - جنات - وحی - نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے - انسان کیا ہے - ان دونوں کا تعلق کیا ہے - تقدیر کسے کہتے ہیں - دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش - بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو یوں کہیئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام
} مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ الآراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق نابینا مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مجالس، منظر اور پس منظر کے اسباب۔ ان واقعات کا دستاویزی تجزیہ۔ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اُسے کوسنے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور بلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد۔ آٹھ روپے، دوسری و تیسری جلد (بقدر روپے فی جلد)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ بیان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے میں۔

بصیرت افروز کتابیں

عہد آفریں کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی یا سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے) (سستا ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام — ۲۵/بی۔ گلبرگ — لاہور